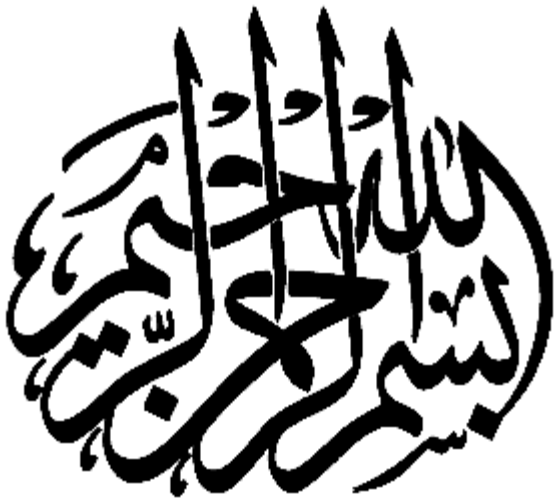
بسم الله الرحمن الرحيم

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

۱۔ "دریافت" ایچ۔ای۔سی (HEC) سے منظور شدہ "Y" کٹیگری کا تحقیقی و تنقیدی مجلّہ ہے جس میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے غیر مطبوعہ مقالات ایچ۔ای۔سی (HEC) کے طے کردہ اصول و ضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تمام مقالات کا اشاعت سے قبل اندرون ملک اور بیرون ملک سے "Double Blind Peer Review" ہوتا ہے جس میں دو سے تین ماہ لگ سکتے ہیں۔

۳۔ دریافت کی اشاعت سال میں دو دفعہ بالترتیب جون اور دسمبر میں ہوتی ہے۔

۴۔ "دریافت" کا اختصاص اردو زبان و ادب کے درج ذیل زمروں میں معیاری مقالات کی اشاعت ہے:

ا۔ تحقیق: متنی / موضوعی۔ ب۔ مباحث: علمی / تنقیدی۔

ج۔ مطالعہ ادب: اردو فکشن / شاعری۔ د۔ تنقید و تجزیہ: اردو فکشن / شاعری، اقبال شناسی وغیرہ

۵۔ تراجم اور تخلیقی تحریریں مثلاً غزل، نظم، افسانہ وغیرہ قطعاً ارسال نہ کی جائیں۔

۶۔ "دریافت" میں مقالہ بھیجنے کے بعد اس کے انتخاب یا معذرت کی اطلاع موصول ہونے تک مقالہ کہیں اور نہ بھیجا جائے۔

۷۔ "دریافت" کی ایچ۔ای۔سی (HEC) میں طے شدہ درجہ بندی 'اردو' ہے۔ دیگر شعبہ جات کے اسکالرز مقالات نہ بھیجیں۔

۸۔ مقالہ اُردو زبان میں ہونا چاہیے۔ کسی دوسری زبان میں لکھا جانے والا مقالہ ناقابلِ قبول ہو گا۔

۹۔ مقالہ بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

i۔ مقالہ صرف OJS (https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft) پر ارسال کیا جائے۔

ii۔ نمل ریسرچ پالیسی کے مطابق مقالے کی فیس -/13,000 روپے مقرر کی گئی ہے تفصیل کے لیے ویب گاہ ملاحظہ کیجیے۔

iii۔ مقالے کا عنوان، محقق کا نام اور عہدے کے متعلق تمام تفاصیل اُردو اور انگریزی کے درست ہجوں کے ساتھ درج کی جائیں۔

iv۔ مقالے کا ملخص (Abstract) اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریباً ۱۰۰-۱۵۰ الفاظ پر مشتمل ہو۔ نیز مقالے کے کلیدی الفاظ Keywords بھی انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھے جائیں۔

v۔ مقالے کی موصولی، مقالے کا قابلِ اشاعت ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع صرف برقی پتا (E.Mail) کے ذریعے دی جائے گی۔ اس لیے مقالہ نگار اپنا مستند برقی پتا، اپنا مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی درج کریں۔

vi۔ مقالے کے ساتھ الگ صفحے پر حلف نامہ منسلک کیا جائے کہ یہ تحریر غیر مطبوعہ ہے، مسروقہ یا کاپی شدہ نہیں ہے۔

vii۔ کمپوزنگ Microsoft Word میں ہو۔ (فائل: A4، مارجن چاروں جانب ایک انچ)۔ متن کا فونٹ سائز ۱۳ رکھا جائے۔ مقالے میں ہندسوں کا اندراج اردو میں ہو۔ مقالے کے لیے صفحات کی تعداد کم از کم ۱۰ سے ۱۵ ہے۔

viii۔ مقالے کے آخر میں حوالہ جات اردو کے ساتھ ساتھ **Roman Script** میں بھی ضرور درج کیے جائیں۔ بصورت دیگر مقالہ قابل قبول نہیں ہو گا۔

ix۔ حوالہ جات میں شکاگو مینوئل (Chicago Manual) فارمیٹ کی پیروی کی جائے۔

x۔ مقالے میں کہیں بھی آرائشی خط، علامات یا اشارات استعمال نہ کیے جائیں۔

xi۔ مجوزہ شرائط پوری نہ ہونے کی صورت میں مقالہ رد کر دیا جائے گا۔

دریافت

جلد : ۱۴ شمارہ:۲

ISSN Online : 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

سرپرستِ اعلیٰ

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری)، ریکٹر

سرپرست

بریگیڈیئر سید نادر علی، ڈائریکٹر جنرل

مدیر اعلیٰ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

مدیر

ڈاکٹر نعیم مظہر

معاون مدیر

ڈاکٹر مجاہد عباس

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

E-mail:daryaft@numl.edu.pk
Web(OJS): https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft

مجلسِ مشاورت

بیرون ملک:

پروفیسر ڈاکٹر ہنس ورنر ویسلر

شعبہ اردو، جامعہ اپسالا، سویڈن

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار

صدرِ شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی، ترکی

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

شعبہ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر شہاب الدین

شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین جینابڑے

سکول آف لینگویج اینڈ لٹریچر اینڈ کلچرل سٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر آسمان بیلن اوزجان

صدرِ شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی، انقرہ، ترکی

پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم

صدرِ شعبہ اردو، فیکلٹی آف آرٹس، یونیورسٹی آف الازہر، قاہرہ، مصر

پروفیسر ڈاکٹر محمد محفوظ احمد

شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نیو دہلی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر محمود الاسلام

شعبہ اردو، فیکلٹی آف آرٹس، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

ڈاکٹر آرزو سوزین

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف استنبول، استنبول، ترکی

اندرونِ ملک:

پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر
صدرِ شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران
شعبہ اردو، جامعہ پنجاب، لاہور
پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس
صدرِ شعبہ اردو، جامعہ کراچی، کراچی
پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین
شعبہ اردو، بہاوالدین زکریایونیورسٹی، ملتان
پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود خٹک
صدرِ شعبہ اردو، یونیورسٹی آف بلوچستان، بلوچستان
پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الحسن
شعبہ اردو، اورینٹل کالج، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور
پروفیسر ڈاکٹر صائمہ ارم
صدرِ شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس
صدرِ شعبہ اردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

~~~~~~

تکنیکی معاونت: محمد ابرار صدیقی

جملہ حقوق محفوظ

دریافت جلد:۱۴ شمارہ:۲ (جولائی تا دسمبر ۲۰۲۲ء)
ناشر: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔ مطبع: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
رابطہ: شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ایچ / نائن، اسلام آباد
فون:10-051-9265100/Ext:2262 ای میل: daryaft@numl.edu.pk
ویب سائٹ(OJS):https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft
قیمت فی شمارہ:۶۰۰ روپے۔ بیرون ملک:۵ ڈالر (علاوہ ڈاک خرچ)
~~~~~~

فہرست

اداریہ

ترکی اور پاکستان کی دوستی کو مربوط کرنے والے مشترکہ یادگاری مقامات کا تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر آیقوت کشمیر	۱
ہجرت کا تاریخی وادبی منظر نامہ اور دیویندر اسّر کا ناسٹلجیا	ڈاکٹر محمد ارشد (کامران)	۱۱
چوہدری افضل حق کی آپ بیتی "میرا افسانہ" کا نو آبادیاتی تجزیہ	وقاص رفیع / ڈاکٹر کامران عباس کاظمی	۲۵
"صحیفہ" کا سر سید احمد خاں نمبر۔۔۔۔ تجزیاتی مطالعہ	فرزانہ رانی / ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	۳۹
اردو ناول میں شنوی فکر کا کلامیاتی تجزیہ	ڈاکٹر محمد نعیم	۵۱
تاریخ ادبِ اردو از جمیل جالبی: تکنیک، معیار، مسائل اور حدود	ڈاکٹر ساجد جاوید	۶۹
حفیظ تائب کی نعت کے تخلیقی زاویے	ڈاکٹر شگفتہ فردوس / ڈاکٹر محمد افضال بٹ	۸۱
اقبال اور رومی کا تعلق ڈاکٹر ملک حسن اختر کی نظر میں	عبید اللہ / پروفیسر ڈاکٹر محمد ارشد اویسی	۹۵
پشاور ٹیلی وژن کے ڈرامے کے ارتقا میں یونس قیاسی کا کردار	راج محمد / ڈاکٹر تحسین بی بی	۱۰۵
خالد فتح محمد کے ناول زینہ میں سماجی شعور	سعدیہ امتیاز / ڈاکٹر مشتاق عادل	۱۱۵
انڈیکس	سدرہ طاہر	۱۲۵

اداریہ

زبان و ادب کے بنیادی وظائف میں سے ایک وظیفہ یہ بھی ہے کہ ان میں سماج و ثقافت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس لیے سماجی نفسیات اور ثقافتی بیانیوں کی تفہیم، توضیح اور تشریح کے لیے زبان و ادب پر تحقیقی و تنقیدی مطالعات سندی و غیر سندی سطح پر تسلسل کے ساتھ منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔ ان مطالعات کی روشنی میں زبان کے بنیادی لسانی خصائص خاص طور پر اصوات، لہجے، اسالیب، رسم الخط اور املا وغیرہ اور ادب کے حوالے سے شعر و نثر کے مختلف موضوعات پر تحقیقات بھی سامنے آتی ہیں یوں زبان و ادب کی تحقیق کے ذریعے سماج اور ثقافت کو سمجھنے کی کوششیں کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔

اردو زبان و ادب میں بھی عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق تحقیق و تنقید کے نت نئے زاویے دیکھنے کو ملتے ہیں تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں عالمی رجحانات اور معیارات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ عالمی سطح پر زبان کے تحقیقی و تنقیدی رجحانات میں روزمرہ کی عملی زبان اور اُس زبان کے لسانی ڈھانچے کا کمپیوٹر کے ذریعے مطالعہ "کارپس لسانیات"، لفظ اور معنی کے تعلقات کے زمرے میں "لغتیات"، ترجمہ و تشریح کے حوالے سے "اصطلاحات"، ذہن و زبان کے تعلق کو موضوع بناتی "علمی زبان" تاریخی و سماجی پس منظر کے حامل مطالعات کے لیے "لسانی بشریات" وغیرہ شامل ہیں جبکہ ادبی حوالے سے زبان و ثقافت کے تعلقات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بیانیوں، کلامیوں، علمیات اور ماحولیات کے مباحث نے ادب کی سماجی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے اور بین العلومی تحقیقات کے نئے زاویے سامنے آئے ہیں۔ ان گزارشات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو تحقیق و تنقید میں بھی ان نئے مباحث پر بھرپور انداز میں کام سامنے آنا چاہیے تاکہ اردو کا دامن بھی علمی جواہر سے قیمتی تر ہو جائے۔

0

عام قارئین کے علاوہ اردو زبان و ادب کی تحقیق و تنقید میں دلچسپی رکھنے والے ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کے لیے خصوصی طور پر دریافت کے جلد ۱۴ شمارہ ۲ کو مرتب کیا گیا ہے جس میں ادب کے ثقافتی و سماجی زاویوں کو اہمیت دی گئی ہے۔ ہم ان تمام ملکی و غیر ملکی مقالہ نگاروں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے معیاری مقالات لکھ کر اس مجلّے میں شائع ہونے کے لیے فراہم کیے ہیں۔ دعا ہے کہ زبان و ادب پر تحقیق و تنقید کی یہ شمع ایسے ہی روشنی بانٹتی رہے۔

مدیران

DARYAFT: ISSN: 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.266

ڈاکٹر آیقوت کشمیر

ایسوسی ایٹ پروفیسر، ایسٹرن لینگویج اینڈ لٹریچر ڈیپارٹمنٹ، فیکلٹی آف لینگویج، ہسٹری اینڈ جیوگرافی، انقرہ یونیورسٹی، ترکی

ترکی اور پاکستان کی دوستی کو مربوط کرنے والے مشترکہ یادگاری مقامات کا تحقیقی جائزہ

Dr. Aykut Kismir

Associate Professor, Eastern Language and Literature Department, Faculty of Languages, History and Geography, Ankara University, Turkiye.

A Research Review of Common Memorial Sites, Connecting the Friendship between Turkey and Pakistan

ABSTRACT

Monuments, schools, hospitals and named streets, parks or squares that are mutually constructed in big cities as examples of historical and cultural values are places of common memory in Turkey and Pakistan. Accurate understanding of the collective past and historical consciousness affects not only the present, but also the shaping of the future. Therefore, cultural phenomena such as tradition, language, and religion, national and religious holidays in the collective past of a society contribute to the formation of historical consciousness and national identity. The memory places, which play an important role in the construction of the common future through the cultural values of the Pakistani and Turkish societies, also reflect the socio-political and cultural memory objects of both societies.

Keywords: *Turkey, Pakistan, Memory, Place of Memory, Cultural interaction, Tradition, Language, Religion, Identity*

باہمی تاریخی اور ثقافتی اقدار کی ستائش کے سلسلے میں ترکی اور پاکستان کے سرکردہ شہروں میں تعمیر شدہ یادگاریں، اسکولز، ہسپتال، نامزد شاہراہیں، سبزہ زار یا چوراہے ایسے مشترکہ یادگاری مقامات ہیں جو ان دونوں ممالک کے درمیان سماجی اور ثقافتی تعامل کو مزید فروغ دیتے ہیں۔ اجتماعی ماضی اور تاریخی شعور کی درست تفہیم نہ صرف حال،

Received: 09th Aug, 2022 | Accepted: 20th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022

DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

بلکہ مستقبل کی تشکیل پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ لہٰذا، ثقافتی مظاہر جیسے روایت، رواج، زبان، مذہب، قومی اور مذہبی تعطیلات کسی معاشرے کے اجتماعی ماضی میں تاریخی شعور اور قومی شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستانی اور ترک معاشروں کی ثقافتی اقدار کے ذریعے مشترکہ مستقبل کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنے والے یادگار مقامات دونوں معاشروں کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی یادداشتوں کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ اس تحقیقی مقالے میں پاکستان اور ترکی کے درمیان ثقافتی تعامل میں فعال کردار ادا کرنے والے یادگاری مقامات کا فرانسیسی مورخ پیئر نورا (Pierre Nora) کے نظریہ یادداشت (lieu de mèmoire) کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، اس تحقیق میں اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ کسی معاشرے کی شناخت کی عکاسی کرنے والے یادگاری مقامات کو کس وجہ سے اور کس طریقے سے ایک تاریخی حقیقت کی علامت کے طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔

ترکی زبان کی لسانی (Etymological) لُغت کے مطابق 'جگہ' (Mekan) کا مفہوم 'واقع ہونے کی جگہ'، 'وقوع پذیر ہونے کا مقام'، 'کسی وجود کی جگہ' کے طور پر بیان ہوتا ہے۔[1] جب کہ اردو کی "فیروز اللغات" کے مطابق جگہ کی تعریف 'رہنے کی جگہ'، 'گھر' یا 'مسکن' کے طور پر کی جاتی ہے [2]۔ لہٰذا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ 'جگہ'، لغت کے معنی میں، عام طور پر نا صرف ایک مادی بلکہ شناخت یافتہ علاقہ ارضی کے بیان میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم، فرانسیسی مؤرخ پیئر نورا Peirre Nora نے اکیسویں صدی میں 'جگہ' کے بنیادی خیال کو مادی اور تجریدی دونوں تصورات کے ساتھ جوڑ کر ثقافتی مطالعات میں اپنی تحقیق کے نتیجے میں " مقامِ یادداشت " (lieu de mémoire) کا نظریہ پیش کر کے سماجی اور ثقافتی علوم میں جگہ کے بارے میں ایک نئی جہت کو روشناس کروایا۔ Nora کے مطابق کسی قوم یا گروہ کی اجتماعی یادداشت میں محفوظ ایک مخصوص جگہ کی نشاندہی کرنے والا "مقامِ یادداشت"، ایک طرف وقت، زبان اور روایت کی اساس پر، تو دوسری جانب کسی تاریخی حقیقت کی علامت پر قائم ہوتا ہے۔ 'یادداشت کی جگہ' ایک عمارت، عجائب گھر، مجسمہ یا کوئی یادگار ہو سکتی ہے یا کسی گروہ کی شناخت سے منسوب کسی تاریخی واقعہ کا مقام، کوئی تخلیقی کام یا پھر کسی تاریخی شخصیت سے متعلقہ مقام بھی ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں Nora کے مطابق یادگاری مقام کی نشاندہی کی ضرورت کے پس منظر میں معاشرے میں 'بھلا دیے جانے کے خوف' کا عنصر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یعنی انسان اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ اہمیت کے حامل واقعات، علامات اور شخصیات کے کردار کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا جائے تاکہ وہ تادیر یاد رکھے جا سکیں۔ چونکہ کچھ مقامات اور جگہیں ماضی کے حالات واقعات کی اصل روح کی حقیقی آئینہ دار ہوتی ہیں اس لئے تاریخی تحقیق و مطالعہ میں ان کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ دنیا کے مختلف معاشروں میں یادگار مقامات 'ماضی کی آواز کو مستقبل میں منتقل کرنے کے اہم ذریعے' کے

طور پر آنے والی نسلوں کو تاریخ سے آگاہ کرنے کا کام کرتے ہیں [۳]۔ در حقیقت تاریخ اور 'مقام یادداشت' کے قریبی تعلق کے ذریعے ہی ایک معاشرے کے آثار کو ماضی سے مستقبل میں منتقل کیا جاتا ہے، یعنی یادداشت لکھواتی ہے اور تاریخ لکھتی ہے [۴]۔

دوسری طرف، فرانسیسی ماہر عمرانیات Halbwachs کے مطابق، اجتماعی یادداشت میں کسی معاشرے کی شناخت، نسلی تناظر یا سیاسی اور سماجی ڈھانچے کے بارے میں اہم نشانیاں محفوظ ہوتی ہیں۔ [۵] اس وجہ سے Halbwachs کسی گروہ کی اجتماعی یادداشت کے اس جگہ سے منسلک ہونے کی یوں وضاحت کرتا ہے۔

> "ہر طرح کی اجتماعی یادداشت کی بنیاد کسی مقام یا جگہ سے متعلق ہوتی ہے۔ تاہم، مقام ایک تغیر پذیر حقیقت ہے۔ اگر ہمارے ارد گرد کے اہم مقامات کو مادی طور پر محفوظ نہ رکھا جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ان جگہوں پر مختلف ادوار کی تجازوات و تبدیلیوں کے باعث ان کی اہمیت ختم ہوتی جائے گی اور ماضی کے اہم یادگار مقامات کی تصویر بھی ذہن سے محو ہو جائے گی۔ کسی بھی قسم کی پرانی یادگار کی دوبارہ تجدید کے لئے ہمارے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت اس 'جگہ' کی ہوتی ہے جہاں وہ واقع ہے۔ وہ جگہ جہاں ہم رہتے ہیں، جہاں سے ہم اکثر گزرتے ہیں، جہاں ہم بآسانی آجاسکتے ہیں اور جس کا تصور ہمارے ذہنوں میں ہر لمحہ قائم رہتا ہے، وہی ہمارا علاقہ، جگہ یا مقام ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقام کی اہمیت کو قائم رکھنے کے لئے ہمارے احساسات اور خیالات کا اس جگہ سے مربوط ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔" [۶]

لہٰذا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسی جگہیں جو ہمارے متعلقہ معاشرے کی تاریخ کو زندہ کرتی ہیں اور اس کی یاد دلاتی ہیں وہ ہمارے جذبات اور خیالات کی دنیا کو تشکیل دینے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ [۷] کے مطابق قومی اجتماعی یادداشت کو مضبوط بنانے اور قومی شناخت کی ترجمانی کرنے والے اہم نمونوں کی بہترین مثالوں میں قومی تعطیلات، علامات، یادگاریں اور یادگاری تقریبات، تعریفی اسناد، لغات اور عجائب گھر شامل ہیں۔

جیسا کہ Nora اپنی کتاب میں بیان کرتا ہے۔ [۸] کہ یادداشتی مقامات میں سب سے اہم ایسے آثار ہوتے ہیں جو کسی زمانے کے تاریخی عروج وزوال کی یادگار کے امین ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ عجائب گھر، آرکائیوز، قبرستان اور مقدس مقامات ماضی کے کسی دور کے شاہد ہوتے ہیں اور ایک طرح سے اس دور کی لافانی یادگار کی تصویر

پیش کرتے ہیں۔ جرمن ماہر مصریات اور ثقافتی محقق جان اسمان[۹] کے مطابق، تاریخی طور پر اہم نمونوں کو عرصہ دراز تک برقرار رکھنے کے لئے ایک مخصوص جگہ میں مجسم شکل دینا ضروری ہوتا ہے، یعنی انہیں ہمیشہ موجود رکھنے کے لئے ایک ٹھوس جگہ اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ حقیقت میں ان یادداشتی مقامات سے کونسے علامتی معنی منسوب کیے جاتے ہیں، بلکہ ایسی جگہیں معنی وعلامات سے بڑھ کر معلومات کا اہم ذخیرہ مہیا کرتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے مقامات صرف ان خصوصیات کے ہی حامل نہیں ہوتے جو یادداشت میں محفوظ ہیں بلکہ اس جگہ پر بِتائے گئے معمولات زندگی اور اور واقعات کا بھی احاطہ کرتے ہیں(Onaran and Kismir 2018: 441)۔ کسی بھی جگہ کے بارے میں ذہنی منظر کشی صرف اس مقام کے طبعی ومادی آثار سے ممکن نہیں ہوتی بلکہ 'کیسے' اور 'کیوں' جیسے سوالات کے جوابات میں اس جگہ سے پیوستہ حکایات وواقعات بھی اس تصور کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ ماضی کی یادداشت سے کسی یادگار میں تبدیلی کا تعلق ذہن میں اس کی وابستگی سے ہے، اس لیے بڑے پیمانے پر بنائی گئی یادگاری تعمیرات عوام کو ان اہم تاریخی حالات وواقعات سے وابستہ رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ڈیزائن کے ساتھ ان سے منسوب معانی کی نمائندگی کرتی ہیں۔

اس تناظر میں، آسٹریا کے فنون لطیفہ کے مورخ ایلوئس ریگل Alois Riegl کی طرف سے لکھے گئے The Modern Cult of Monuments (۱۹۰۲)نامی تحقیقی کام میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یادگاریں انسان کی طرف سے تخلیق کی جاتی ہیں تاکہ آنے والی نسلوں کے ذہن میں اپنا نشان چھوڑ سکیں۔ اس طرح، یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مقصد ماضی اور تاریخ کو حال میں زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے، جس دور میں کوئی یادگار، مجسمہ یا کوئی مقدس مقام بنایا گیا تھا، اس زمانے کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی خصوصیات بھی ایک لحاظ سے حال اور مستقبل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔

پاکستان اور ترکی کے درمیان دوستانہ تعلقات کی ایک طویل تاریخ ہے جس کی بنیاد بہت سارے مشترکہ ثقافتی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی عوامل میں پائی جاتی ہے۔ دونوں ممالک نے آڑے وقتوں میں ہمیشہ ایک دوسرے کا خیال رکھا اور عالمی سطح پر حمایت مہیا کی۔ اسی طرح دوطرفہ روابط کو مضبوط ومربوط بنانے اور مشترکہ تاریخی وثقافتی اساس کو آنے والی نسلوں کے لئے تادیر یادداشت کا حصہ بنانے کے لئے دونوں ممالک نے کئی جگہوں پر یادگاری مقامات بھی قائم کئے ہیں۔ ذیل میں ہم پاکستان اور ترکی میں ایک دوسرے کو خراج تحسین پیش کرنے والے اہم یادگاری مقامات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اتاترک بلیوارڈ اسلام آباد

۱۹۷۳ میں جمہوریہ ترکی کی ۵۰ ویں سالگرہ کی یاد میں اسلام آباد کی ایک شاہراہ کا نام "اتاترک بلیوارڈ" رکھا گیا، جس کی افتتاحی تقریب ۲ نومبر ۱۹۷۳ کو پاکستانی وفاقی وزیر خورشید حسن میر اور اسلام آباد میں ترک سفیر ایردم ایرنر کی شرکت میں منعقد ہوئی۔ اس سڑک کی لمبائی،، تقریباً چار کلو میٹر ہے۔ افتتاحی تقریب میں پاکستانی وزیر نے کہا کہ "مجھے اپنے دارالحکومت میں اتاترک کے نام کو یاد گار کرتے ہوئے خوشی ہوئی، جس طرح اتاترک نے انقرہ کو جدید ترکی کا دارالحکومت بنایا تھا اسی طرح اسلام آباد بھی جدیدیت کی روح کی عکاسی کرتا ہے"[۱۰]

اتاترک یادگار، لاڑکانہ

۱۹۷۳ میں ہی جمہوریہ ترکی کی ۵۰ ویں سالگرہ کی یاد میں، پاکستان کے شہر لاڑکانہ کے مرکز میں ۲۵ میٹر اونچی اتاترک یادگار تعمیر کی گئی جس کا افتتاح ۳۰ نومبر ۱۹۷۳ کو کیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد ۱.۵۷ میٹر اونچی ہے جو سُلیمانی ماربل سے بنی ہے۔ یادگار پر مصطفیٰ کمال اتاترک کا نام سنہری حروف میں ترکی اور انگریزی میں کندہ ہے جبکہ اس کے نیچے اردو اور سندھی زبانوں میں اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے اتاترک کے بارے میں تعریفی الفاظ سنگ مرمر پر نقش ہیں۔ لاڑکانہ میں پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور ترک جمہوریہ کے وزیر مملکت ایلہان اوزترک کی شرکت میں منعقدہ یادگار کی افتتاحی تقریب میں، وزیر اعظم بھٹو نے اتاترک کے لیے اپنی تعریف کا اظہار ان الفاظ میں کیا: "ہم جنگ سکاریہ کے عظیم ہیرو اتاترک کی عظمت کو سلام پیش کرتے ہیں، وہ ایک ایسے مثالی سپاہی تھے جنہوں نے ترکی کو سامراجیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے بچایا، قرون وسطیٰ کی ذہنیت کے خلاف جنگ کی اور ایک مصلح کا کردار نبھایا، وہ ایک جمہوریت پسند لیڈر تھے جو اپنے ملک کی سیاسی زندگی کو جدید خطوط کے مطابق ترتیب دینا چاہتے تھے۔"۔[۱۱]

جناح جادیسی (شاہراہِ جناح) انقرہ

انقرہ کی اہم شاہراہوں میں سے ایک ، جس کا پرانا نام ڈاکٹر ولی رشید شاہراہ تھا، کا نام فروری ۱۹۷۵ میں منعقدہ ایک تقریب میں تبدیل کر کے شاہراہِ جناح رکھ دیا گیا۔ اس وقت انقرہ میٹروپولیٹن میونسپلٹی کے میئر، ویدات دولاکئے نے کہا، "یہ شاہراہ پاکستان کے عظیم رہنما اور سیاستدان محمد علی جناح کے نام سے یاد رکھی جائے گی۔ ہم چانکایا Çankaya (انقرہ کی ایک میونسپلٹی)، جہاں اتاترک نے اپنے انقلابات کی منصوبہ بندی کی تھی، کی طرف جانے والے اس رستے کو جناح کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا راستہ بھی بہت مشکل اور کٹھن تھا، لیکن وہ خود جانتے تھے کہ

اس راستے کی کٹھنائیوں سے کیسے نبرد آزما ہو کر آزادی جیتنا ہے۔ ہر روز، انقرہ کے ہزاروں لوگ اس شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے ان کی مشکل اور کامیاب زندگی کی کہانی کو یاد کریں گے۔[۱۲] انہوں نے انقرہ میں اس وقت کے پاکستانی سفیر الطاف احمد شیخ کے ساتھ مل کر ایک تقریب میں اس شاہراہ کا نام تبدیل کیا۔ اس موقع پر پاکستانی سفیر نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان کے شہروں کراچی اور اسلام آباد میں دو اہم سڑکوں کا نام اتاترک کے نام پر رکھا گیا ہے۔

علامہ محمد اقبال کی تمثیلی تُربت: قونیہ

۱۹۶۵ء میں ترکی کے شہر قونیہ میں پاکستان کے قومی شاعر محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸) کی مولانا جلال الدین رومی (۱۲۰۷-۱۲۷۳) کے احاطہ مزار میں ایک تمثیلی تربت قائم کی گئی کیونکہ اقبال، مولانا رومی سے روحانی قربت رکھتے تھے اور انہیں اپنا مرشد مانتے تھے۔ احاطہ مزار رومی میں اقبال یادگار حیثیت بخش دی ہے۔

محمد اقبال پارک: قونیہ

پاکستان کے قومی شاعر محمد اقبال کی یاد میں، قونیہ میں ایک پارک کا نام عظیم شاعر کے نام پر رکھا گیا۔

جامع مسجد اقبال: قونیہ

ترکی کے شہر قونیہ میں پاکستان کے قومی شاعر محمد اقبال کی یاد میں ایک مسجد بنائی گئی ہے۔

پاکستانی جنگی جہاز، انقرہ

۱۴ اپریل ۱۹۹۸ سے پاکستانی فضائیہ سے تعلق رکھنے والے شین یانگ F-6 قسم کا جیٹ نمبر ۱۴۱۲۳ انقرہ ایئر فورس میوزیم میں نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔[۱۳]

پاکستان ترکی فرینڈشپ ووکیشنل اینڈ ٹیکنیکل اناطولین ہائی سکول، وان

Anatolia Pak-Turk Friendship Vocational and Technical High School: Van

۱۹۶۳ میں گرلز آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے تعلیمی سرگرمیوں کے آغاز کے بعد ۲۰۰۵ میں اس سکول کا نام کمرشل ووکیشنل ہائی اسکول رکھ دیا گیا۔ سنہ ۲۰۱۱ میں ترکی کے شہر وان میں آنے والے زلزلے کے بعد، سنہ ۲۰۱۴ میں پاکستان اور ترکی کی حکومتوں کے درمیان طے پانے والے معاہدے کے نتیجے میں، حکومت پاکستان کی جانب سے عطیہ کردہ امدادی رقم سے اسکول کی نئی عمارت کی تعمیر ایک نئے مقام (گورنر متہت محلہ) پر کی گئی۔ (۱۴) اس سکول کی عمارت کی بنیاد پاکستان اور ترکی کی دیرینہ دوستی کے ذیل میں زلزلہ کے متاثرین کی بحالی کے پیش نظر ۱۱ دسمبر سنہ ۲۰۱۲ میں پاکستان ارتھ کوئیک ری کنسٹرکشن اینڈ ری ہیبلیٹیشن اتھارٹی (ERRA) کے صدر حامد یار ہراج اور ترکی

کے وزیر اعظم پروگرام برائے ڈیزاسٹر اینڈ ایمرجنسی مینجمنٹ (AFAD) کے صدر ڈاکٹر فواد اوکتائے کی شرکت سے منعقدہ ایک تقریب میں رکھی گئی۔ ۱۶ جون ۲۰۱۳ کو پاکستان ترکی فرینڈشپ ووکیشنل اینڈ ٹیکنیکل اناطولیہ ہائی سکول کا افتتاح اس وقت کے وان کے گورنر منیر کاراوغلو اور ترکی قومی اسمبلی کی پاکستان ترکی فرینڈشپ ایسوسی ایشن کے صدر جناب برہان کایاترک کی طرف سے کیا گیا تھا۔

رجب طیب اردگان ہسپتال، مظفر گڑھ

سنہ ۲۰۱۰ میں پاکستان میں سیلاب کے باعث شدید تباہی کے بعد جمہوریہ ترکی کی جانب سے پاکستان کے شہر مظفر گڑھ میں ۱۰۰ بستروں پر مشتمل رجب طیب اردگان ہسپتال بنایا گیا۔ اس کے علاوہ، نومبر ۲۰۰۵ میں پاکستان میں آنے والے زلزلے کے بعد، آزاد جموں کشمیر میں آزاد کشمیر یونیورسٹی اور خیبر پختونخواہ میں بہت سے سرکاری اداروں کو جمہوریہ ترکی کے تعاون سے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ (۱۵)

ترک پاس، اسلام آباد

۱۷ فروری سنہ ۲۰۱۵ میں وزیر اعظم پاکستان محمد نواز شریف اور وزیر اعظم جمہوریہ ترکی پروفیسر ڈاکٹر احمد داؤد اوغلو نے اسلام آباد کے پاکستان نیشنل ایتھنوگرافی میوزیم میں پاکستان اور ترکی کی مشترکہ آرٹ، ثقافت اور روایات کے پیش کردہ ایک سیکشن کا افتتاح کیا۔ (۱۶)

استنبول چوک، لاہور

نومبر ۲۰۱۵ میں پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعظم شہباز شریف اور ترکی میں پاکستان کے سفیر صادق بابر گرگین نے پاکستان کے اہم شہر لاہور، جو پنجاب کا صوبائی دارالحکومت بھی ہے، کے مرکز میں استنبول چوک کا افتتاح کیا۔ استنبول چوک کا آرکیٹیکچرل ڈیزائن، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کالج آف فائن آرٹس اور انجینئرنگ فیکلٹی میں کام کرنے والے پاکستانی ماہرین نے بنایا تھا۔

نتیجہ

نتیجے کے طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترکی اور پاکستان کے اہم شہروں میں باہمی تاریخی اور ثقافتی اقدار کی مثالوں کے طور پر تعمیر شدہ یادگاریں، اسکول، ہسپتال، نامزد سڑکیں، پارکس یا چوراہے، مشترکہ یادداشت کی جگہیں ہیں جو دونوں ممالک کے درمیان سماجی اور ثقافتی تعامل کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اجتماعی ماضی اور تاریخی شعور کی درست تفہیم نہ صرف حال بلکہ مستقبل کی تشکیل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ثقافتی

مظاہر جیسے روایت، رواج، زبان، مذہب، قومی اور مذہبی تعطیلات، کسی معاشرے کے اجتماعی ماضی میں تاریخی شعور اور قومی شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستانی اور ترک معاشروں کی ثقافتی اقدار کے ذریعے مشترکہ مستقبل کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنے والے یادگار مقامات دونوں معاشروں کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی یادداشتوں کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ Eyuboglu, I. Zeki, Turk Dilinin Etimolojik Sozlügü. Istanbul: Sosyal Yayinlar, 2004,P, 479

۲۔ فیروز الدین، محمد، رنگین فیروز الغات اردو جامع، فیروز سن، لاہور، ۲۰۱۲، ص۔۱۳۳۸

۳۔ Nora, Pierre , Hafiza Mekanları. Cev. M.Emin Ozcan, Ankara: Dost Kitabevi, 2006, P,30

۴۔ ایضا، ص، ۳۴

۵۔ Halbwachs, Maurice, Kolektif Bellek. Cev. Z.Karagoz, Istanbul: Pinhan Yayincilik,2018, P,116

۲۔ ایضاً، ص، ۱۷۴

(اس کے علاوہ کتاب "یادداشت اور یادیں" (۲۰۲۱) میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یادداشت ایک زندہ شے کی مانند ہوتی ہے جو بات چیت کے ذریعے اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔ لہذا، ایک انسان صرف اجتماعی یادداشت کے فریم ورک میں سمائی جانے والی یادوں کو ہی دیر تک برقرار رکھتا ہے جبکہ اس فریم ورک کی جزوی یا مکمل گمشدگی سے مراد بھول جانا ہے (Kismir,(۴۴-۲۰۲۱:۴۳)

۷۔ Nora, Pierre , Hafiza Mekanları. Cev. M.Emin Ozcan, Ankara,P,9

۸۔ ایضاً، ص، ۲۳

۹۔ Assmann, Jan, Kulturel Bellek. Cev. A.Tekin, Istanbul: AyrintiYayinlari,2015, P, 47-46

۱۰۔ Akbar, Abdul, Pakistan Turkiye Kardesligini Tarihte Gecen Olaylar Aracılıgıyla Kutlamak. Ankara: Pakistan Buyuk Elciligi Ankara, 2018, P,157

۱۱۔ ایضا، ص،۱۵۸

۱۲۔ ایضا، ص،۱۵۸

۱۳۔ https://ankarahavamuze.hvkk.tsk.tr/Custom/AnkaraHavaMuze/49

۱۴۔ https://vantml.meb.k12.tr/

۱۵۔ Akbar, Abdul, Pakistan Turkiye Kardesligini Tarihte Gecen Olaylar Aracılıgıyla Kutlamak. Ankara: Pakistan Buyuk Elciligi Ankara, 2018, P,164

۱۶۔ ایضاً، ص،۱۶۵

References in Roman Script:

1. Eyuboglu, I. Zeki, Turk Dilinin Etimolojik Sozlügü. Istanbul: Sosyal Yayinlar, 2004,P, 479.
2. Feroz ud Din, M. Rangeen Feroz ul Lughat Urdu Jamay. Lahore: Ferozsons, 2012, P,1338
3. Nora, Pierre , Hafiza Mekanları. Cev. M.Emin Ozcan, Ankara: Dost Kitabevi, 2006, P,30
4. Ibid,P,34
5. Halbwachs, Maurice, Kolektif Bellek. Cev. Z.Karagoz, Istanbul: Pinhan Yayincilik,2018, P,116
6. Ibid,P,174
   (Kismir, Gonca (2021). Bellek ve Anımsama. İstanbul: Kriter Yayınevi.)
7. Nora, Pierre , Hafiza Mekanları. Cev. M.Emin Ozcan, Ankara: Dost Kitabevi, 2006, P,9.
8. Ibid,P,93

9. Assmann, Jan, Kulturel Bellek. Cev. A.Tekin, Istanbul: AyrintiYayinlari,2015, P, 47-46
10. Akbar, Abdul, Pakistan Turkiye Kardesligini Tarihte Gecen Olaylar Aracılıgıyla Kutlamak. Ankara: Pakistan Buyuk Elciligi Ankara, 2018, P,157
11. Ibid,P,158
12. Ibid,P,158
13. https://ankarahavamuze.hvkk.tsk.tr/Custom/AnkaraHavaMuze/49, 02 March 2022
14. https://vantml.meb.k12.tr/). 11 May 2022Ibid, Page 50
15. Akbar, Abdul, Pakistan Turkiye Kardesligini Tarihte Gecen Olaylar Aracılıgıyla Kutlamak. Ankara: Pakistan Buyuk Elciligi Ankara, 2018, P,164
16. Ibid,P,165

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.268

ڈاکٹر محمد ارشد (کامران)

ہائر ایجوکیشن کمیشن پی سی ڈی نمبر: S.No.22955 اسلام آباد۔

ہجرت کا تاریخی و ادبی منظر نامہ اور دیویندر اسّر کا ناسٹلجیا

Dr. Muhammad Arshad (Kamran)

Higher Education Comission PCD # S.No 22955, Islamabad.

Historical and Literary Background of Migration and Devender Isar's Nostalgia

ABSTRACT

Expressing melancholy and emotional yearning of the past time, called Nostalgia is cause of people movement from homeland to other city, state, country or region, seeking for employment, education, political asylum, citizenship or persuading security in safer and less crimes places or safeguard from environmental disaster etc. is called migration which, since long, has resulted in manifold complications. As an immigrant, despite of forcedly bifurcating from his homeland for one reason or the other, he can never eradicate his past memories and deep attachments with motherland. Soon after the division of subcontinent, people of the area also left their origin to settle down in new country for safety and security but during crossing the durned line, brutal violence and pitiless massacres on both sides caused enormous killing of family members and abduction of young girls and women.

Keywords: *Nostalgic, Melancholy, Yearning, Migration, Massacres.*

آدم کی خلدِ بریں سے مادی دنیا کی سمت ہجرت نے نقل مکانی کی جس روایت کا آغاز کیا تھا وہی روایت مختلف پیغمبروں، مذاہب اور اقوام سے ہوتی ہوئی آج کے جدید دور میں بھی بر قرار ہے بلکہ انسان کے علاوہ چرند پرند بھی ہجرت کی اسی روایت پر عمل پیرا، شدتِ موسم سے بچاؤ اور خوراک کی تلاش میں سمندر تک عبور کر جاتے

Received: 10th Aug, 2022 | Accepted: 15th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022

DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

ہیں۔کتاب اللہ میں تخلیقِ انسان سے متعلق آگاہی دلائی گئی ہے کہ "خَلَقَ الاِنسَانَ مِن صَلصَالٍ کَا لفَخَّار" 'ہم نے انسان کو کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا'، چنانچہ اپنے تخلیقی عمل کی تکمیل کے بعد انسان اسی مٹی میں سے ہی اپنے رزق کی تلاش میں سرگرم رہا ہے جس کے لیے اسے فکرِ معاش اور حفظِ جان کی خاطر ہجرت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ ہجرت کی آدم تا ایں دم، قائم یہ رِیت تا قیامت برقرار رہے گی تاہم ہجرت بصورتِ جبر اختیار کرنے سے ماضی کی یادیں انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتیں اور وہ عمر بھر جنم بھومی سے جدائی کے کربناک انگاروں پر لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں محمد امان اللہ خان کے ذیل کے اقتباس میں نہاں فرقتِ وطن کے کرب کی عکاسی قابلِ غور ہے:

> "انسان وقت کے دھارے میں بہتا نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آیا... کبھی اجنبی دیسوں میں بیگانہ ہوا کبھی ان بستیوں کو اپنا لیا... خانہ بدوشی، نقل مکانی، جلاوطنی، شجرِ ممنوعہ، یا شہرِ تمنا، ارضِ موعودہ یا جنتِ گم گشتہ کی تلاش، کبھی خوشی کی تلاش تو کبھی سکون کے حصول کے لیے بار بار اپنی زمین، اپنے ماضی، اپنی بنیادوں سے علیحدہ، ہو کر ماضی اور زمین کی یادیں وطن کے روپ میں ذہن میں بسا کر درد و غم سمیٹتے ہوئے وقت کے دھارے میں بہتا چلا گیا۔"(۱)

ہجرت کا تاریخی منظر نامہ

آج کے جدید دور میں جس طرح انسان کبھی ذاتی خواہشات تو کبھی ضروریاتِ حیات کی تکمیل یا پھر جنگ و جدل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھی ہجرت کی راہ اپنانے کی روایت بہ آسانی اختیار کر لیتا ہے جس سے نقل مکانی کا سلسلہ بھی آئے روز وسعت پذیری اختیار کرتا جا رہا ہے، کسی زمانے میں انسان کے لیے گاؤں سے شہر میں بسنا بھی مشکل مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ مگر اس کے مقابل اب تو متقلیئ سکونت کے سلسلے کی کڑیاں شہر سے شہر کے علاوہ ملکوں ملک، بلکہ برّاعظم سے برّاعظم جا ملی ہیں نتیجتاً نقل مکانی کی وسعت پذیری نے عالمی امن کو بھی شدید خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ تاریخی تناظر میں بیسویں صدی کو ہجر و الم کی صدی کہنا اس لیے بھی بے جا نہیں ہے کہ محض ۱۸۲۱ء سے ۱۹۲۴ء کے دورانیے میں ساڑھے پانچ کروڑ سے زائد لوگ سمندر پار نقل مکانی پر مجبور ہوئے تھے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء کے دورانیے میں روس میں سفید اور سرخوں کی خانہ جنگی کے نتیجے میں دس لاکھ روسی ہجرت پر مجبور ہوئے۔ برطانوی نو آبادیات کے زمانے سے مختلف ممالک کے مکینوں کی امریکہ نقل مکانی کا سلسلہ آج بھی زور و شور سے جاری ہے۔ اسی طرح جرمن کی برازیل میں آبادکاری کا آغاز ۱۸۲۴ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جرمنی میں یہودیوں کے خلاف فسادات نے نہ صرف ان کی نقل مکانی کو فروغ دیا بلکہ مشرقی اور مغربی جرمنی کی سرحدی تقسیم اور اشتراکی حکومت کے قیام

سے لوگوں کی مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی کی جانب منتقلی کا سلسلہ زور شور سے پھیلتا چلا گیا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد صرف یورپ میں ۱۵/ ملین جرمن افراد، جرمنی کی سرحدوں سے باہر جا بسے تھے۔ نقل مکانی کی یہی روایت ۱۹۴۹ء میں ۸/ لاکھ افراد کی ہجرت سے مزید توانا ہوگئی۔ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں بھی تقریباً ۴۸/ لاکھ سے زائد افریقی باشندے امریکہ کی مختلف ریاستوں کی جانب عازمِ سفر ہوئے۔ یونان کے باشندوں نے ۱۸۲۹ء کے بعد دوسری بار بھی ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۷ء کے درمیانی عرصہ میں آسٹریلیا کی ہجرت کو معمول بنالیا بلکہ یونان نے از خود بھی پچاس ہزار ترک، سمرنا اور ایشائے کوچک کی جانب دھکیل دیے تھے۔ اکیسویں صدی کے آغاز ۲۰۱۵ء سے افریقی اور ایشیائی ممالک کے تارکینِ وطن ہجرت کی نئی راہیں تلاش کرتے ہوئے، یورپ، کینیڈا اور امریکہ میں ورود کے لیے اسپین اور اٹلی کی راہ اپنانے کی بجائے یونان کا راستہ اختیار کرنے کو فوقیت دینے لگے ہیں۔ اسی طرح خانہ جنگی کے نتیجے میں بوسنیا کے مسلمانوں کی مختلف ممالک کی جانب ہجرت اور افغانستان میں روس اور امریکہ کی دخل در اندازی کے نتیجے میں بپا خانہ جنگی کے دوران، افغان باشندوں کی مختلف ممالک کو ہجرت بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

امریکہ اور یورپی ممالک کو نقل مکانی کے علاوہ برّصغیر پاک و ہند کا خطہ بھی حملہ آوروں کی تاریخ کے حوالے سے خاصا مشہور رہا ہے جو یہاں کے باسیوں کے لیے ترکِ سکونت و ہجرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ سب سے قدیم نسل دراوڑ قوم کے مغربی ایشیا سے آکر یہاں قدم جمانے کے بعد اسی بھیڑ چال میں ایرانی النسل آریاؤں کا بھی ورود ہوا۔ مہابھارت جنگ کے بعد آریاؤں کا عمل دخل ختم ہونے کے ساتھ ہی عرب، ترک اور ایرانی النسل اقوام بھی اس علاقے میں داخل ہونے لگیں مگر اپنے طویل دورِ حکومت کے باوجود بھی انھوں نے اپنے ماضی کے مسکن سے رشتہ استوار رکھا۔ اسی ناسٹیلجیا کا شکار ہونے پر یہ اقوام، نسل در نسل یہاں بسنے کے باوجود بھی اپنی اصل شناخت پر قائم رہتے ہوئے آج بھی خود کو شیرازی، اصفہانی، افغانی، ایرانی اور ترکی کہلانے پر نازاں ہیں۔ مسلم فاتحین اور صوفیائے کرام کی تقلید میں انگریز سامراج بھی پہلے پہل تجارت کی غرض سے ۱۶۰۳ء میں یہاں آئے مگر بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی چالوں اور منافقانہ حربوں کے بل بوتے پر مغل حکمرانوں کی شہنشایت نیست و نابود کرتے ہوئے باقاعدہ تخت پر قابض ہوگئی تھی جس کے خلاف برِّصغیر پاک و ہند کے باسیوں میں غیض و غضب کے جذبات کا پنپنا فطری عمل تھا، جس کا اظہار ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خون سے ہاتھ رنگنے پر کیا گیا مگر جواب میں انگریز سامراج بھی برّصغیر پر مکمل کنٹرول کے بعد بدلہ لینے پر اتر آیا۔ انگریزوں کی جانب سے تقریباً ایک صدی کے طویل دورانیے کے بعد ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کی برّصغیر سے واپسی کی نوید سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ افراد نے بھارت سے پاکستان نقل کی۔ شومئ قسمت کہ آزادی کی خوشیوں کے چراغ ابھی روشن بھی نہ ہو پائے تھے کہ انگریز سامراج کی سازش و طبقاتی

منافرت، مذہبی جنون، سرحد کی دونوں جانب پروان چڑھتے نفرت انگیز روّیے اور سب سے بڑھ کر نام نہاد لیڈروں کی نا اہلی کے رنگ لانے پر مسلم، سکھ اور ہندوؤں کے دلوں میں پنپنے والی منافرت کی دراڑیں خون کی ہولی پر منتج ہوئیں۔ بچے کھچے مہاجرین، نئے دیس میں پہنچ کر بھی سکھ کا سانس لینے کی بجائے اپنی آنکھوں کے سامنے نہ صرف بہو، بیٹیوں کی عصمتیں لٹتی دیکھتے رہے بلکہ کم و بیش پانچ لاکھ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے قتل کے اندوہناک واقعات کے صدمات ان کے قلب و ذہن سے باہر نکال ہی نہ پائے۔ یوں تو دل و دماغ پر چھائے درد و الم کے جوار بھاٹا کی شدت کا ازالہ کسی حد تک اپنے کرب کے اظہار سے ہو ہی جاتا ہے مگر ان مہاجرین کو اپنے آبائی مسکن کی مٹی کی مہک، شہر اور گلیوں میں کھیل کود کر گزری بچپن کی حسیں یادیں، شکستہ خواب، نئے وطن کے اجنبی ماحول میں آبادکاری جیسے مسائل نے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔ نقل مکانی کا عمل محض جسمانی سفر تک محدود نہیں ہوا کرتا بلکہ ہجرت میں جسمانی سفر کے آغاز کے بعد یادِ وطن کا عارضہ اور ماضی کی حسرت ناک یادوں کا ناگ انسانی ذہنوں کو ڈستے ہوئے انھیں ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی کچھ ہمارے صاحبِ بصیرت اہلِ قلم برادری کے شاعروں، ناول اور افسانہ نگاروں کے ساتھ بھی پیش آیا اور اکثر افسانہ نگار بذاتِ خود ہجرت کے قافلے میں شامل رہے ہیں جو دورانِ ہجرت وقوع پذیر متعدد خون آشام واقعات کے چشم دید گواہ بھی رہے ہیں۔ انہی کی بدولت اردو افسانے کو نت نئے موضوعات میسّر آئے جس سے ناول کے بالمقابل اردو افسانہ بھی نئی کروٹیں بدلتا جلاوطنی کے کرب میں ڈوبنے لگا۔ اسی قبیل کے خونی واقعات کے چشمِ دید گواہ نند کشور وکرم، اپنے ریل کے سفر کی کتھا ذیل کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "تقسیم سے متعلق بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میں نے دیکھی ہیں اور میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں نے ہندوؤں کو بھی مرتے دیکھا ہے اور مسلمانوں کو بھی۔ میں امبالہ میٹرک کا امتحان دینے آیا تھا میرے ساتھی نے شلوار پہنی ہوئی تھی اس لیے ہم بھی شک کے دائرے میں آ گئے اور کپڑے اتروا کر ہماری شناخت کی گئی۔ ہمارے پاس ہی داڑھی والا مسلمان بیٹھا تھا، اسے تلوار سے مار کر چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ آج تک وہ چیخیں میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ میں نے اپنے ناول انیسواں ادھیائے میں ایک باب کا عنوان ہی 'ریپ آف راولپنڈی' رکھا ہے۔"(۲)

نقل مکانی اور جلاوطنی کی اقسام میں سیاسی وجوہات کی بناء پر کی گئی جلاوطنی، ماحول کی ناآسودگی کی بناء پر کی جانے والی جلاوطنی، خارجی جلاوطنی، داخلی جلاوطنی اور خود اختیاری جلاوطنی وغیرہ شامل ہیں۔(۳) کسی ملک کے باسیوں کو ان کی جائے پیدائش سے زبردستی، سیاسی، معاشی یا معاشرتی دباؤ کے تحت جدا کرنا ہجرت کہلاتا ہے البتہ خانہ جنگی

سے پناہ لینے کے لیے اختیار کردہ ہجرت، جبری جلاوطنی کے زمرے میں آتی ہے۔ ہجرت کی قبیل کوئی بھی ہو، ہجرت کے کربناک احساس میں ڈوبا جلاوطن مسافر، اجنبی دیس کے اجنبی لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبوری کے باوجود بھی شعوری یا غیر شعور طور پر اپنی جڑیں اجنبی دیس میں ہرگز پیوست نہیں کرنا چاہتا اسی لیے تادمِ آخر، وطن سے جڑی ماضی کی ہر یاد، وہ سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ بچھڑے ماضی کے نشے میں چُور دیویندر اسّر کے فن پاروں میں بھی ناسٹلجیائی عنصر کی بازگشت کے علاوہ فرقتِ وطن کی یاد کا رنگ متعدد ادیبوں کے ہاں بھی عکس انداز ہوا ہے۔ دیویندر اسّر کی تخلیقات میں اس رنگ کی تلاش سے قبل ہجرت سے متعلق ادبی منظر نامے پر نگاہ ڈالنا بھی مفید رہے گا۔

ہجرت کا ادبی منظر نامہ

جس طرح ہر عمل کے منفی اور مثبت دو پہلو ہوا کرتے ہیں اسی طرح ہجرت کے المیے کے دیگر منفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ماضی کی حسین یادوں کا مثبت پہلو بھی ابھر کر سامنے آیا ہے اور فرقتِ وطن کے کرب (Nostalgia) کی بدولت عالمی ادبی افق پر اعلیٰ پائے کی فکری و ادبی تخلیقات ابھر کر سامنے آئیں جن میں پولینڈ کے سال بیلو اور آئزک سنگر جیسے تخلیق کاروں کا ناول 'جنت گم گشتہ'، البیر کامیو کی تخلیق 'اجنبی'، ہرمن ہیسے کی 'سدھارتھا'، فلسطینی شاعر محمود درویش کی نظم 'ڈینوب نیلا نہیں ہے' اور عرب تخلیق کار خلیل جبران اور دیگر ادباء کی 'ادب المہجر' (ہجرت کے دیس کا ادب یا پردیسی شاعری)' اور انڈونیشیا کے ناول نگار پرمودیہ آنند طور کا ناول 'دھرتی کے دکھ' جیسے ادبی شہپارے شامل ہیں۔ عالمی ادب کی پیروی میں اردو ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پایا، چنانچہ برّصغیر کے نامور ادیبوں شاعروں اور ناول نگاروں نے بھی طویل عرصہ تک ہجرت اور جلاوطنی سے متعلق موضوعات قلمبند کرتے ہوئے اپنے احساس کی توانائیاں تابندہ رکھیں۔ خصوصاً افسانہ نگار جب ذاتی تجربات کے پسِ منظر میں اپنے خیالات و تجربات کا رنگ افسانوی کینوس پر، جذباتی انداز میں بکھیرتا ہے تو ادب کا قاری، افسانہ نگار کے تیکنیکی، اسلوبیاتی و فکری تجربات اور جذبات کے ورتارے سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ہندوستانی ادب کے ناول کے پسِ منظر میں کالی داس کے شاہکار 'شکنتلا' انشاء کی 'رانی کیتکی کی کہانی'، حیدر بخش حیدری کی 'آرائشِ محفل' سے شروع ہونے والے وطن سے جدائی کے کرب (ناسٹیلجیا) کا ادبی تسلسل میر امن کی 'باغ و بہار میں' دہلوی تہذیب کے ماحول کی عکاسی سے ہوا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کے جلاوطنی میں مرتبہ 'فسانۂ عجائب' سے بھی ناسٹلجیائی عنصر بخوبی عکس انداز ہوا ہے۔ عام حالات میں وقت کا گزر تا لمحہ، عموماً بطور مرہم پرانے زخم مندمل کر دیتا ہے جس سے درد و الم کی شدت میں کسی حد تک کمی آجاتی ہے مگر پھر بھی انسان اپنے پیدائشی وطن کے شہر، محلے، گلیاں، گھر اور صحن بھلا کہاں بھول سکتا ہے۔ نتیجتاً ترکِ سکونت اختیار کرنے والوں کے اذہان پر چمگادڑ کی طرح چپکی وطن سے محبت کی یادیں عمر بھر زندہ و توانا رہتی ہیں۔ قرۃ العین

حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کا ناسٹلجیائی عکس، فرقتِ وطن کی یادوں پر مبنی انتظار حسین کے ناول 'آگے سمندر ہے'، عبداللہ حسین کے 'اداس نسلیں' اور خدیجہ مستور کے 'آنگن' کے عنوان پر مرتبہ ناولوں میں بھی نمایاں ہے۔ جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے تو اردو ادب کی کم و بیش دو سو سالہ تاریخ میں ۱۹۰۸ء سے قبل مختصر افسانے کی باقاعدہ شکل نہیں ملتی لیکن پریم چند بطور 'ادب برائے زندگی' کے پیروکار نے جب افسانوی دنیا میں قدم رکھا تو ترقی پسندی کے نئے رنگ اس حد تک ابھر آئے کہ انگریز حکومت نے ان کے مجموعے 'سوزِ وطن' کی تمام کاپیاں ضبطگی کے ساتھ ہی نذرِ آتش کر دیں مگر اب راہِ طلب کے اس اکیلے مسافر کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک 'رومانوی افسانہ نگاروں' کا اچھا خاصہ ایسا گروہ پیدا ہو چکا تھا جو زبان و بیاں کی خوبصورتی نکھارنے میں حقیقی مسائل سے اجتناب برتتے ہوئے خیالات و تصورات کے تانے بانے بننے لگا تھا جس کے سرخیلوں میں پریم چند (شروع کے دور میں) سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور اور حجاب اسمٰعیل وغیرہ شامل تھے۔ ان میں پریم چند اس لیے نمایاں ہیں کہ انھوں نے پہلی بار کامل ادراک سے عوامی مسائل مؤثر انداز میں پیش کیے ہیں۔ ماضی کی یاد میں ڈوبے، مستقبل کی فکر میں مبتلا افسانہ نگار، اپنے فن پاروں میں ہجرت کے صدمات، اور پیدائشی وطن سے جدائی کی یادیں، بطور کربناک المیہ ابھار کر سامنے لائے تھے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھانے والے افسانہ نگاروں کی کثیر تعداد سرحد کے دونوں جانب ہجرت کرنے والوں پر مشتمل تھی یہی وجہ ہے کہ ماضی کی باز آفرینی (ناسٹیلجیا) کی جھلک ان کے فن پاروں میں رقصاں نظر آتی ہے۔

متعدد افسانہ نگاروں کے ہاں ہجرت کے موضوعات پر مبنی فن پاروں میں اجاگر کی گئیں جلاوطنی کی مختلف نوعیتوں کا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ تقسیم کے فوراً بعد افسانوی ادب میں جبری جلاوطنی سے بیدار ہونے والی ذہنی جلاوطنی کا عکس سعادت حسن خان منٹو کے افسانے 'کھول دو'، جمیلہ ہاشمی کے 'بن باس'، رامانند کے افسانے 'بھاگ ان بردہ فروشوں سے' عصمت چغتائی کے 'جڑیں' اور احمد ندیم قاسمی کے 'گڈریا' میں نمایاں ہوا ہے۔ غلام عباس کے افسانوں میں جسمانی و ذہنی جلاوطنی کے پسِ منظر میں ذات اور ماحول کا باہمی موازنہ پیش ہوا ہے۔ عبداللہ حسین کے 'مہاجرین' کے عنوان سے افسانے میں خود ساختہ جلاوطنی کے پسِ منظر میں جنم لینے والی نئی تہذیبی و ذہنی جلاوطنی کا موضوع اور 'ندی' افسانے میں تہذیبی و نفسیاتی جلاوطنی کا عنصر اجاگر ہوا ہے۔ ان کے 'سمندر' کے عنوان پر مبنی افسانے میں ارضی و نفسیاتی مسائل اور 'دھوپ' میں جسمانی، ذہنی، اور روحانی جلاوطنی کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ جلاوطنی اور احساسِ تنہائی کا کرب ان کے افسانے 'جلاوطن' میں بھی کھل کر بیان ہوا ہے۔ رام لعل کے 'اکھڑے ہوئے لوگ'، 'نئی دھرتی پرانے گیت' اور 'ایک شہری پاکستان کا' عنوان پر مبنی افسانوں کے علاوہ 'قبر' افسانے میں بھی

جسمانی، ذہنی اور روحانی جلاوطنی کے موضوعات اجاگر ہوئے ہیں۔ خود ساختہ اور جبری جلاوطنی پر مشتمل جغرافیائی، تہذیبی، ذہنی، جسمانی اور روحانی جلاوطنی جیسے موضوعات کا عنصر نمایاں کرنے والے افسانوں میں جوگندر پال کے 'باشندے' اور 'دریاؤں کی پیاس'، کنہیالال کپور کا 'ہندوستان دیکھیے'، امراؤ طارق کا 'دراڑوں میں سانپ' وغیرہ شامل ہیں۔ فرخندہ لودھی کے 'بوٹیاں' اور 'شباب: گھر کے راستے پر'، محمد اشرف کے 'ڈار سے بچھڑے'، شوکت حیات کے 'گھونسلا'، میں بھی جلاوطنی کا ناسٹلجیائی رنگ نمایاں ہوا ہے۔ ہمارے جن افسانہ نگاروں کو مشرقی پاکستان کے سانحے کی بدولت ہجرت کا ذائقہ دوسری بار بھی چکھنا پڑا، ان میں اختر جمال کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے اپنے دکھوں کی کہانی 'دوسری ہجرت' افسانے کی زبانی بیان کرتے ہوئے آبائی وطن سے محبت کی یاد کے چراغ جلائے ہیں۔ اسی طرح آصف فرخی کے 'یادوں کے پردیس' اور 'بیاہی بدیس'، سمیعہ نعمت کے 'آزادی کے بعد' اور فاطمہ حسن کے 'زمین حکایت' وغیرہ کا شمار بھی اسی قبیل کے افسانوں میں کیا جاسکتا ہے۔

ادبی منظر نامے میں ہجرت کے تکلیف دہ سفر میں ظلم و ستم کا نشانہ زیادہ تر عورت ہی بنی رہی ہے جسے نہ صرف غیروں کے ظلم و ستم اور جنسی استحصال کے وار سہنے پڑے بلکہ عزت لٹ جانے کے بعد اسے عموماً اپنوں کی بے مروتی بھی لے ڈوبی تھی۔ عورتوں کے ساتھ روا ظلم و ستم کی المناک داستان سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانے 'کھول دو' میں سکینہ کے کردار میں پیش کی ہے۔ قدرت اللہ شہاب بھی 'یاخدا' افسانے میں عورت کا یہی المیہ پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نوعیت کے کربناک تجربات جمیل ہاشمی کے افسانے 'بن ماس' اور خدیجہ مستور کے 'مینوں لے چلے بابلا' میں بھی نمایاں انداز میں پیش ہوئے ہیں۔ جس طرح جلاوطنی اور ہجرت کے احساسات معروف ناول نگاروں کے ہاں اجاگر ہوئے ہیں ناسٹیلجیا کا وہی کرب بطور حساس دل افسانہ نگار، قرۃ العین حیدر کے اعصاب پر بھی سوار رہا جو اپنے متعدد افسانوں میں کہیں نمایاں تو کہیں بین السطور میں اپنے جذبات منعکس کرنے میں اس لیے بھی کامیاب رہی ہیں کہ انھیں بھی بذاتِ خود ہجرت کے تیر کا نشانہ دو بار بننا پڑا تھا۔ چونکہ ان میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کی حس مفقود تھی اسی لیے انھوں نے لاہور آکر یہاں بسنے کی کوشش ضرور کی مگر پھر ماحول سے بیزار ہو کر دوبارہ بھارت پلٹ گئیں۔ ان کے خیال میں ہجرت کے بعد خاندانوں کے بکھراؤ نے بے اختیاری اور بے اعتباری کو جنم دے کر برّصغیر کو دو ملکوں میں ہی تقسیم نہیں کیا بلکہ انسان کی اپنی شخصیت بھی دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی جسے ملکی بٹوارے کی بجائے انسانی شخصیت کے بٹوارے کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ ہجرت کے صدمات کا کرب جن افسانہ نگاروں کی پہچان بنا، ان کے سرخیل انتظار حسین ہی تھے جنھیں بذاتِ خود ملکی تقسیم سے نفرت کی دیواریں کھڑی ہونے کے بعد ماضی کی یادیں بھلانے میں ذہنی کرب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انتظار حسین چونکہ ماضی کی گم شدہ روایات کی تلاش میں سرگرداں، یادِ

ماضی کے کرب کا داغ مٹانے کی کوشش میں مگن رہے ہیں اسی لیے انھیں ناقدین سے ناسٹلجیا کا شکار ہونے کے طعنے بھی سننے پڑے۔ انتظار حسین کے متعدد افسانے کبھی تو قاری کو اپنے ساتھ پیچھے رہ جانے والے محلے اور بازاروں میں لے جاتے ہیں تو کبھی 'مشکوک لوگ' افسانے کے کردار کے روپ میں، لاہور کے گلی محلوں میں گڑ اور گجک کی لذت تلاش کرتے نظر آتے ہیں تاہم ان کے ہاں ناسٹلجیا، کرب وانبساط کی مخلوط شکل میں سامنے آیا ہے۔

اشفاق احمد اپنے دور کے متعدد افسانہ نگاروں کی طرح تقسیم، ہجرت، دورانِ ہجرت قتل و غارت کے اندوہناک واقعات اور ماضی کی یادوں کے حصار میں گھرے 'داؤجی'، 'پروفیسر دیس راج' اور 'پتاجی' کو یاد کرتے رہے ہیں مگر گذرتے وقت کے ساتھ ان کی یادوں کے زخم اس لیے بھی مندمل ہوتے گئے ہیں کہ ان کی یاد کا محور، دھرتی اور اس کی کھوکھ سے جنم لینے والی تہذیبی اقدار اور رسومات کی بجائے باکردار شخصیات رہی ہیں۔ 'توبہ افسانے' کی اشاعت سے افسانوی دنیا میں قدم رکھنے والے اشفاق احمد کی وجہ شہرت دیگر افسانوں کے علاوہ ان کا ہر دلعزیز پروگرام 'تلقین شاہ' رہا ہے۔ جوگندر پال نے 'پناہ گاہ' افسانے میں جاگیردارانہ استحصال کے مرکزی کرداروں جاگیردار، پنڈت، ساہوکار اور بنیا کے روپ میں چھپے بھیڑیوں کا مکروہ چہرہ قاری کے سامنے واضع کیا ہے۔ پنجاب کی تقسیم سے متعلق 'چھوڑا ہوا شہر' افسانے کا عنوان ہی ہجرت کے کرب کا دیباچہ ہے اور 'تروسیاں' افسانہ بھی ہجرت کے کرب پر مبنی صورتحال بیان کرتا ہے۔ 'خیال صورت' افسانہ ماضی کی جانب مراجعت کا سفر ہے جو حقیقت میں تو ممکن نہیں البتہ خیالوں میں ایسا کرنا یوں ممکن ہے کہ قاری بھی سریندر پرکاش کی طرح لائل پور کی گلیوں میں اپنا بچپن تلاش کرتا پھرے۔ ان کے افسانے 'سوکھا' کا عبدالعزیز ہاشمی نامی کردار پاکستان بننے کا زبردست حامی ہونے کے باوجود بھی پاکستان ہجرت کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ 'میرا سفر اور چیچو کی ملیاں' کا آغاز جرمنی کے سفر کی یاد سے ہوتا ہے جس میں افسانہ نگار نے ادیبوں کے بطور یارانِ محفل ذکر کے بعد دوستوں سے بچھڑنے کے غم کے پسِ منظر میں تقسیم، ہجرت، پاک و ہند کشیدگی کے مکروہ اثرات وغیرہ پر ماہرانہ کمنٹری کی ہے۔ نند کشور وکرم اور دیویندر اسّر کی زندگی کا پل پل باہم اکٹھا گزرنے سے دونوں کی باہمی سوچ میں بھی یک رنگی دکھائی دیتی ہے۔ نند کشور وکرم کو بھی اپنے جنم بھومی سے شدید لگاؤ رہا ہے بلکہ وہ گزشتہ برسوں کی طرح ۲۰۱۹ء میں بھی پاکستان آئے تو راولپنڈی کے مضافات میں اپنے سابقہ گاؤں کی یاترا میں اپنے نوے سالہ دیرینہ دوست سے ملکر از حد جذباتی ہو گئے تھے۔ نند کشور وکرم کے افسانوں اور ناولوں میں بھی ہجرت کا کرب اور جنم بھومی سے عقیدت واحترام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ نند کشور وکرم کے افسانے 'ایک پاکستانی کی موت' کے ایک کردار کی دوبارہ پاکستان آنے کی خواہش دل ہی میں دم توڑ جاتی ہے اور اسے اپنے جنم بھومی میں دوبارہ آنا نصیب نہیں ہوتا۔ نند کشور وکرم کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوست دیویندر اسر

کے مدوّن اور غیر مدوّن افسانوں اور ناول 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' میں بھی جنم بھومی کی حسین یادوں کا کرب اور ناسٹلجیائی رنگ بآسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

دیویندر اسّر کا ناسٹلجیا

برّصغیر کی تقسیم سے ٹھیک ۱۹/ برس قبل ۱۴/ اگست ۱۹۸۲ء کو حسن ابدال ضلع کیمبل پور (حال اٹک) کے نامور وکیل پنڈت شری ناتھ اِسّر کے گھر پیدا ہونے والے دیویندر اسّر کا بچپن اور لڑکپن کیمبل پور میں گزرا یہیں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور بی اے کا امتحان دینے کے بعد عارضی طور پر کانپور ہجرت کر گئے مگر پھر آخر دم تک بھارت ہی میں رہے جہاں اک طویل عرصہ سکونت پذیری کے باوجود بھی وہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح جنم بھومی کی محبت کی زنجیر میں جکڑے رہے ہیں۔ دیویندر اسّر کو جدائی کے کرب کا پہلا تجربہ پانچ سال کی عمر میں ماں کے سینے پہ سر رکھ کر سونے کے بعد ہوا جب ماں کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جانے پر اسے ماں کی گود سے زبردستی الگ کیا گیا تو اس وقت نوعمری میں انھیں یہ شعور بھی نہ تھا کہ یہ ماں کی گود سے عملی زندگی کی جانب ان کی پہلی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہجرت ہے۔ اسی لیے بچپن میں ماں کی گود سے جدائی کا یہ کرب ان کے شعور و لاشعور کی تہہ میں کچھ یوں رچ بس کر رہ گیا تھا کہ زمانہ بیت جانے کے باوجود بھی وہ ماں کی یاد، دماغ کے نہاں خانوں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہی نہ ہو پائے:

> "کتنا سمے بیت گیا، میں نہ اپنی ماں سے الگ ہو سکا اور نہ ہی اپنے اندر کے بچے ہی کو اپنے پیچھے چھوڑ سکا۔ اپنی ماں کی نابھی ڈور سے بندھا اپنے اندر کے بچے کو، گود میں اٹھائے کوئی کتنا لمبا سفر طے کر سکتا ہے۔"(۴)

ماضی کے تصوّراتی سفر کے میں شام کے دھندلکے میں پرانی حویلی میں دیویندر اسّر کی ماں سے خیالی ملاقات سے بیٹے کی ماں سے محبت اور دیویندر اسّر کی ناسٹلجیائی سوچ کی بھرپو عکاسی ہوئی ہے۔ اس تصوّراتی ملاقات میں ماں اپنے بیٹے سے پوچھتی ہے:

> " دیو! کیسے ہو؟... تم کتنے بڑے ہو گئے ہو؟ کھانا لائی ہوں.. لو کھاؤ۔' میں نے ہاتھ بڑھایا' کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں۔"(۵)

دیویندر اسّر اپنے چاروں افسانوی مجموعات 'گیت اور انگارے'، 'شیشوں کا مسیحا'، 'کینوس کا صحرا' اور 'پرندے اب کیوں نہیں اڑتے' کے متعدد افسانوں کے علاوہ اپنے ناول 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' اور غیر مدوّن افسانوں 'بیتے موسم کا مکالمہ'، 'نئی رت کا راگ' 'سدھارتھ' اور 'مسٹر روشو' وغیرہ میں بھی یادِ ماضی اور فرقتِ وطن

کے کرب کے پسِ منظر میں اپنی داستانِ حیات کی کڑیاں ملانے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ 'مسٹر روشو' افسانے کے آغاز ہی میں جب انھیں گھر میں داخل ہونے سے روکا جاتا ہے تو وہ ہاتھ میں چرمی بیگ لیے گھر کا دروازہ گھورتے ہوئے چپ چاپ باہر نکل آتے ہیں۔ قاری اس واقعے کو افسانہ نگار کی ذاتی داستانِ حیات کا حصہ تسلیم کرنے میں حق بجانب اس لیے بھی ہے کہ دیویندر اسّر کو بھی حقیقی زندگی میں یہی صورتحال درپیش رہی ہے۔ ان پر بھی اُسی گھر کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا تھا جسے وہ انتہائی عسرت کے دور میں خون پسینے کی کمائی سے تعمیر کرنے میں کامیاب رہے تھے لیکن شومیئ قسمت کہ گھر کے مکینوں نے ان سے وہاں جینے کا حق ہی چھین لیا تھا:

> "اس دن وہ کسی ادبی نشست سے واپس آئے۔ انھوں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ مسٹر روشو نے دوبارہ دستک نہیں دی۔ ایک لمحہ اس بند دروازے کو دیکھا جسے وہ کئی راتوں کو نیم وا رکھتے تھے کہ وہ نجانے کب ڈرامے کی ریہرسل سے لوٹے اور اسے دستک نہ دینی پڑے، مسٹر روشو بغیر چاپ کیے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ مین گیٹ کھولا اور باہر سڑک پر آ گئے۔"(۶)

بیگم کے زہر آلود گستاخانہ روّیے سے عاجز، اپنے گم گشتہ ماضی کی یادوں میں گم سم 'مسٹر روشو' کے دورانِ بارش ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے زیرِ تعمیر کیچڑ میں لت پت مکان میں داخل ہوتے ہی ماضی کے تکلیف دہ مسائل کی سرنگ منہ کھولے ان کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ یہیں پر مافوق الفطرت ہستی کے روپ میں استاد کا ظہور اور 'مسٹر روشو' کی بطور شاگرد ان سے ملاقات، دراصل دیویندر اسّر کا داستانِ ماضی کے ورتارے میں تلاشِ سکون کی جانب قدم ہے۔ اسی طرح افسانے میں 'مسٹر ونے'، سابقہ اسٹوڈنٹ 'روزنا' وغیرہ پر مبنی غیر مرئی کرداروں سے ملاقاتیں 'مسٹر روشو' افسانے کو دیویندر اسّر کو ماضی کی یاد کے سفر پر روانہ کر دیتی ہیں۔ ان کے تجریدیت پر مشتمل افسانے 'بیتے موسم کا مکالمہ' کی کہانی میں بھی 'پربلا دراے'، 'مونا' اور 'روزنا' جیسے کرداروں کے پسِ منظر میں دیویندر اسّر اپنے گزرے ماضی کے واقعات کی ورق گردانی میں مصروفِ عمل دکھائی دیے ہیں۔ نئے وطن میں بطور مہاجر کربناک صورتحال کا سامنا انھیں اس لیے بھی رہا کہ انھیں نہ صرف اپنا خاندان نئے وطن میں آباد کرنا تھا بلکہ ساتھ ہی نئی ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنے اور ساکھ بنانے کے لیے بھی نئے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ اس سے قبل طفلانہ دور میں بھی انھیں ماں کی گود سے جدائی کے بعد پیدائشی شہر حسن ابدال کا گھر اور صحن بھی چھوڑنا پڑا تھا۔ کیمبل پور آ کر بچپن کے نئے دوستوں سے استوار تعلقات ہونے پر گلی محلے میں پروان چڑھنے والی دوستی سکول کے بعد کالج کے دور میں مزید توانا اور مضبوط ہو گئی تو لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی محبت کے رشتوں کی یہ بساط اچانک الٹ گئی اور دیویندر اسّر نے

گلی، محلہ، کھیل کے میدان، دوست، بلکہ مہربان استاد تک چھوڑ کر ہجرت کا کرب جھیلا جس کے بعد جنم بھومی کی یاد کا کرب ان کے دل و دماغ میں کچھ یوں رچ بس گیا کہ نہ تو ان کے دل سے اس مٹی سے محبت کا جذبہ مٹ سکا اور نہ ہی وقت اور فاصلوں کی وسیع خلیج، ان کے وطن سے جدائی کے زخم مندمل کر پائی:

"تم جہاں پیدا ہوئے اس دھرتی سے، اس نگر سے، اس گاؤں سے اس جنگل سے ہجرت کر سکتے ہو لیکن اپنے اندر سے اس دھرتی کو اس نگر کو اس گاؤں کو، اس جنگل کو باہر نہیں کر سکتے۔"(۷)

دیویندر اسّر کے پیدائشی شہر کیمبل پور (اٹک) سے مرزا حامد بیگ کے موصولہ خط کے جواب میں وہ اپنے، ماضی کی یاد میں غلطاں و پیچاں بچھڑے شہر کے گلی محلوں کی سیر کو جا نکلتے ہیں:

"جب میں الفاظ لکھ رہا تھا آسمان پر کوئی بادل نہیں تھا شاید وہ دور ویرانے میں بھٹک رہا ہو گا۔ اسے بھی اپنے دیش سے یادوں بھرا پیارا سا پیغام ملا ہو گا جسے پڑھ کر وہ یک بارگی رو دیا ہو گا اور اتنا رویا ہو گا، اتنا برسا ہو گا کہ اپنے وطن پہنچ گیا ہو گا۔ میں رو نہیں سکتا۔ لیکن یہ الفاظ لکھ کر ایک بار اپنے وطن پہنچ گیا ہوں کیمبل پور جو ایک شہر نہیں۔ دل کی بستی کا نام ہے۔" (۸)

دیویندر اسّر عمر بھر اپنے گزشتہ ماضی کے ارمانوں کے تعاقب میں دل کی اسی بستی کی گلیوں میں جیون کے کھوئے اثاثے تلاش کرتے نظر آئے ہیں:

"یوں تو شہر میں گلیاں اور کوچے ہوتے ہیں۔ اینٹ اور پتھر کے مکان ہوتے ہیں۔ بجلی کے کھمبے ہوتے ہیں۔ کیمبل پور سے بڑے اور خوبصورت اور جاہ و جلال والے شہر موجود ہوتے ہیں، لیکن وہ گلی کہاں ہے جس میں کسی دیوار کے سائے میں چھپ کر کسی سے ملنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ وہ سڑک کہاں ہے جو لوہے اور سٹیل کی سائیکل میں بھی دل کی دھڑکن پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بجلی کا کھمبا کہاں ہے جس کے نیچے رات گئے آنکھ مچولی ہو جاتی ہے۔"(۹)

جنگی ہولناک تباہیاں کوئی بھی ذی شعور بھلائے نہیں بھول پاتا اسی لیے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ختم ہونے کے بعد جب سرحد کی دونوں اطراف کے اہلِ فکر جنگ کے نقصانات کا اندازہ لگا رہے تھے تو دیویندر اسّر کے

لیے یہ لمحہ ناقابلِ برداشت اس لیے بھی تھا کہ وہ دونوں ملکوں کے مکین رہے تھے۔ وہ نئے وطن کے نقصانات پر افسردہ ضرور تھے مگر ساتھ ہی انھیں اپنی جنم بھومی کے ہولناک جنگی نقصانات کا تخمینہ بھی لگانا تھا :

> ...''ہندوستان اور پاکستان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ریڈیو پر سنا جہاں بم گرا وہ میرا شہر تھا۔ اچانک وہ پورا شہر ایک دوشیزہ کی طرح انگڑائی لے کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تم نے کہا تھا اس مٹی کے لیے تم اپنی جان تک کی بازی لگا دو گے اور آج تم اس پر بم پھینکتے ہو۔ اور خوشی کے شادیانے بجاتے ہو کہ تم نے دشمن کا کتنا نقصان کیا... کیا ہم تمھارے دشمن ہیں۔ دیکھو دیکھو ہمارے چہرے۔ کیا یہ چہرے وہی چہرے نہیں، بچپن میں جن میں تمھارا اپنا چہرہ بھی تھا۔''(۱۰)

دیویندر اسّر نے اسطوری پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے 'پلازما کے جراثیم'، 'انسان اور انسان'، 'گیت اور انگارے'، 'میوزیم' اور 'سدھارتھ' جیسے افسانوں میں ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے پر ناسٹلجیائی رنگ نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے افسانے 'انسان خلا اور موت' میں نیلماں سے معاشرے کے وڈیروں کے ظالمانہ سلوک کی داستان کے پسِ منظر میں یادِ ماضی کے علاوہ 'ننگی تصویر' کی ہیروئن کی زبانی اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی کہانی کے بیان کے پسِ منظر میں ماضی کی یادوں کا کرب ماورائی انداز میں پیش کیا ہے۔ دیگر افسانہ نگاروں کی طرح دیویندر سّر نے ماضی کی باز آفرینی کے تجربات اپنے ناول 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' میں بھی حال کے سٹیج پر براجمان ہو کر ماضی کے نہاں خانوں میں جھانکتے ہوئے کامیابی سے پیش کیے ہیں۔ یادِ ماضی کی ماورائی پگڈنڈی پر موجود ویران حویلی سے واپسی پر ماں سے تصوراتی ملاقات کے بعد اُسی 'شیلی' نامی لڑکی کی بھی آوازیں دیویندر اسّر کی سماعت سے مسلسل ٹکراتی رہتی ہیں جس 'شیلی' کو وہ جوانی کے عالم میں بامرِ مجبوری چھوڑ کر چلے گئے تھے مگر طویل عرصہ گزرنے کے باوجود بھی وہی 'شیلی' ان کے دماغ کے نہاں خانوں سے باہر نکل ہی نہ پائی۔ 'شیلی' سے ہونے والی مکالمہ بازی دیویندر اسّر کے ناسٹلجیائی عکس کا منظر نامہ ہے:

> '' میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے ساتھ لے لو'۔ ہاں میں نے ضد کی۔ تم نہیں مانے۔ تمھیں مجھ پہ وشواس نہیں تھا۔ شاید اپنے پر بھی نہیں، میں نے کہا تھا، تم نے زندگی دیکھی ہے مجھے نہیں۔ اور اب تم بیکار نہیں۔ سب کچھ ہے تمھارے پاس... پھر بھی تم؟ خیر... میں نے تو صرف یہی کہا تھا کہ جب تم پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگو گے میں ہولے سے تمھیں شال اوڑھا دوں گی۔ جب تم لکھتے لکھتے تھک جاؤ گے تو تمھاری میز پر گرم گرم کافی کا پیالہ

رکھ دوں گی اور ہاں تمھیں سردیوں میں سانس کی شکایت ہو جاتی ہے نا۔ تمھاری چھاتی پر
ہولے ہولے بام مل دوں گی... چھوڑو جو بیت گئی سو بیت گئی۔ دیکھو رات کتنی ٹھٹھری
ہوئی ہے کیسے کاٹو گے ؟ دیو!" (۱۱)

دیویندر اسّر کے ناول میں ان کے فرقتِ وطن کی یاد پر مبنی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں کیمبل پور کی چھلاٹ ندی میں زندگی میں پہلی مرتبہ کسی جوان حسینہ کے ساتھ نہانے کا حسین تجربہ انھیں بار بار ماضی کے جھروکوں سے صدائیں لگاتا رہتا ہے۔ ان کے متعدد کردار ماضی کے جھروکوں سے دیویندر اسّر کو اپنے ساتھ واقعاتِ زیست کی یاد کے نشے میں مدہوش رکھتے ہیں۔ الغرض اپنے ہم عصر متعدد افسانہ نگاروں کی طرح دیویندر اسّر ماضی کی حسین یاد کے کرب میں مبتلا ہو کر اپنے کرداروں کی معرفت ناسٹلجیائی عنصر کی بھرپور انداز میں عکس بندی میں کامیاب رہے ہیں۔

بحث کا اختتام ملکی تقسیم کے بعد نئے وطن میں بس جانے کے باوجود بھی فرقتِ وطن کی حسین یادوں کی بازیافت میں تڑپنے کی روایت برقرار رکھنے والے کردار کے تذکرے پر کیا جاتا ہے۔ یہ زندہ نسوانی اور حقیقی کردار ۹۰/ سالہ رِینا ورما، نامی خاتون کا ہے جو اپنی ۱۵/ سالہ لڑکپن کی عمر میں ہی پاکستان سے بھارت ہجرت کرنے کے بعد وہاں کے نئے ماحول میں گزر بسر کرنے لگی تھی مگر طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنے پیدائشی شہر راولپنڈی کے کالج روڈ کی گلیاں، اپنے گھر کا چوبار بھول ہی نہ پائی۔ اور حال ہی میں ۷۵ سال بعد پاکستان آکر اپنے پیدائشی گھر اور جنم بھومی کی گلیاں گھومتے ہوئے خود کو جوان اور توانا محسوس کر رہی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ امان اللہ خان؛ محمد: اردو نظم میں ہجرت و جلاوطنی کا اظہار اور نظریہ پسِ نو آبادیات؛ مشمولہ مذاکرہ، شمارہ ۱، جلد ۲۰۲۰، ۳، اسلام آباد۔

۲۔ نند کشور وکرم: ایک دانشور کی موت؛ مشمولہ ایک دانشور، ایک مفکّر، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۔

۳۔ روبینہ الماس: اردو افسانے میں جلاوطنی کے تجربے کا اظہار؛ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۔

۴۔ دیویندر اسّر: خوشبو بن کے لوٹیں گے؛ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، نیو دھلی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۔

۵۔ ایضاً: ص ۸۴

۶۔ دیویندر اسّر: مسٹر روشو؛ چہار سو، دیویندر اسّر نمبر، جلد ۵۱، شمارہ، مئی تا جون، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۶۔
۷۔ ایضاً: خوشبو بن کے لوٹیں گے؛ ایضاً، ص ۱۴۔
۸۔ ایضاً: ص ۵۰۔
۹۔ ایضاً: ص ۵۲۔
۱۰۔ ایضاً: ص ۳۱۔
۱۱۔ ایضاً: ص ۸۴۔

Roman References

1.Aman Ullah Khan, Muhammad, Urdu Nazm Mein Hijrat Awr Jalawatni Ka Izhar Awr Nazriya Pas Now Abadiyat, Mashmoola Muzakara, Issue 1 Voulm 1, Islamabad, 2020,
2.Nand Kishor Vikram,Aik Danishwar ki Mout, Mashmoola Aik Danishwar, Aik Mufakkir, Publishers and Advisors , Dehli, 2013, P.21
3. Robina Almas, Urdu Afsany Mein Jalawatni Kay Tajarby Ka Izhar, Bahaul Din Zakriya Univeristy, Multan, 2003, P.1
4.Dewandir Asar, Khushboo Ban Kay Loutein Gy, Publishers and Advertisors, Krishan Nagar, New Dehli, 1988, P.14
5. Ibid, P.84
6.Dewandir Asar, Mr Rosho, Chahar Su, Dewandir Asar Number, Volum 51, Issue May to June, Faiz Ul Islam Printing Press, Rawalpindi, 2006, P.16
7. Dewandir Asar, Khushboo Ban Kay Loutein Gy, P.14
8. Ibid, P.50
9. Ibid, P.52
10. Ibid, P.31
11. Ibid, P.82

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.269

وقاص رفیع

پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو، بین الاقوامی، اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

صدر شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

چوہدری افضل حق کی آپ بیتی "میرا افسانہ" کا نو آبادیاتی تجزیہ

Waqas Rafi
Scholar Ph.D Urdu Department, International Islamic University, Islamabad.
Dr. Kamran Abbas Kazmi
Head Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad.

A Colonial Analysis of "Mera Afsana" An Autobiography of Choudhary Afzal Haq

ABSTRACT

The purpose of this article is to analyze Chaudhry Afzal's autobiography "MeraAfsana" in the colonial context. We have seen how the colonial system and its inhabitants were able to establish and rule their colonies in India. Neocolonialism is a system in which powerful nations take control of weaker nations. By using the resources of the subjugated nation to increase their economic and statistical efficiency, they continue to strengthen themselves. This makes the economy of the settlers stronger. When a country occupies another country through its military power, it is the beginning of the formation of the colonial system.

Keywords: *Chaudhry Afzal, Mera Afsana, Autobiography, Colonialism, subcontinent.*

جب کوئی ملک اپنی عسکری طاقت کے ذریعے کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرتا ہے تو وہ نو آبادیاتی نظام کی تشکیل کی شروعات ہوتی ہیں۔ دنیا میں جہاں یہ نو آبادی قائم کی جاتی ہے وہاں کے مقامی باشندوں پر قابض اپنے قوانین

Received: 04th Aug, 2022 | Accepted: 12th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

معاشرت اور حکومت بھی مسلط کر دیتے ہیں۔ نو آبادیات ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت طاقتور اقوام کمزور اقوام پر قبضہ جما لیتی ہیں۔ حاکم قوم اپنی معاشی و اقتصادی استعداد بڑھانے کے لیے محکوم قوم کے وسائل استعمال میں لا کر خود کو مضبوط کرتی رہتی ہیں۔ جس سے نو آبادکاروں کی معیشت مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ کسی غیر علاقے کے لوگوں کا اپنی سرحدی حدود کو پار کر کے دوسری کمزور اقوام کے اقتدار اعلی کو ختم کر کے وہاں کے مقامی لوگوں کو اپنا غلام بنا کر اور ان کے حقوق و وسائل کا استحصال کر کے اپنی ریاست کو ہر حوالے سے طاقت ور بنانا نو آبادیات کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی تناظر میں طاہرہ غفور لکھتی ہیں۔

> "کسی غیر ملک طاقت کا اپنی سرحدی حدود سے باہر دوسری اقوام کے اقتدارِ اعلی کو ختم کرنا اور مقامی لوگوں کے حقوق و وسائل کا استحصال کر کے اپنے آبائی وطن کو معاشی طور پر مضبوط کرنا نو آبادیات کہلاتا ہے۔"(۱)

اورنگزیب عالمگیر کی وفات ایسا سانحہ تھا جس نے مغلیہ سلطنت کو نہ صرف داخلی حوالے سے کمزور کر دیا بلکہ بیرونی سازشوں اور حملوں نے اسے بہت نقصان پہنچایا۔ غیر ملکی طاقتوں نے آہستہ آہستہ قدم جمانے شروع کر دیے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لیے پرتگالیوں اور دیگر اقوام کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ہندوستانی عوام کی بھرپور مدد کی اور بلا شرکت غیرے اپنے قدم پیوست کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سیاسی و معاشی ابتری نے عوام کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا اور لوگ بے بسی اور محتاجی کے سائے تلے پلنے لگے۔ اس صورت حال میں مقامی لوگ اپنا سب کچھ کھو کر کسی ایسی غیبی مدد کا انتظار کر رہے تھے جو ان کے لیے کارگر ثابت ہو۔ ان حالات و واقعات کا پس نظر دیکھا جائے تو اس وقت مقامی لوگوں کو نو آبادیاتی نظام اپنے مفاد میں نظر آیا۔ اس تمام صورت حال کا تذکرہ ہمیں اس عہد کے ادب میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

انگریزوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں سترھوں صدی میں نو آبادیات قائم کرنا شروع کر دیں تھیں۔ آہستہ آہستہ اور وقت کے ساتھ ساتھ برطانوی سامراج کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد برصغیر کی مکمل حکومت انگریزوں نے ہتھیا لی۔ تاریخ کا یہ وہ اہم موڑ تھا جس سے مسلمانوں کو نہ قابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی ہر لحاظ سے کچلا جانے لگا اور گھٹیا سمجھا جانے لگا۔ انگریزوں کے ارادوں کو تقویت ملنے لگی اور ہر طرف ان کا چرچا شروع ہو گیا۔ اس کی واضح مثالیں ہمیں اس عہد کے ادب میں واضح دکھائی دیتی ہیں۔ اسی تناظر میں طاہرہ غفور لکھتی ہیں۔

"نو آبادیاتی اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ سماج میں اس کے پنجے ابھی تک گڑھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہندوستانی معاشرے کی اپنی الگ تہذیب اور روایات تھیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد نہ صرف افواج کی جنگیں ہوئی بلکہ مشرق و مغرب کی تہذیبیں آپس میں ٹکرائیں۔ نو آبادیاتی عہد کی ان تبدیلیوں کا اثر ادب پر بھی ہوا۔ اس دور میں لکھا جانے والا ادب ہندوستانوں کے سیاسی و سماجی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔"(۲)

انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی انگریزی سامراج کی وجہ سے ہندوستان کی معاشرتی اور سیاسی و سماجی زندگی کی رفتار بالکل بدلنے لگی۔ مغلوں کی سیاست کے بعد جس حکومت و سیاست نے قبضہ کیا نہ وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر تھی نہ ہندو کے لیے مناسب تھی بلکہ انگریز کی سامراجی حکومت تھی۔ یہ ایک ایسی حکومت تھی جس کا مقصد صرف صرف تجارت اور تجارت کے بعد ہندوستان پر قبضہ تھا۔ اس حکومت نے آہستہ آہستہ ہندوستان کے تمام علاقوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنا محکوم بنا کر لیا۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر انور سدید اپنی شہرہ آفاق کتاب "اردو ادب کی تحریکیں" میں رقمطراز ہیں:

"انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ہندوستان میں معاشرتی اور سیاسی زندگی کی رفتار بالکل تیز ہو گئی۔ مغلوں کے زوال کے بعد جس سیاسی قوتوں نے غلبہ حاصل کیا نہ وہ مسلمان سے متعلق تھی نہ ہندوؤں سے ،بلکہ وہ انگریز کی تحویل میں تھی۔ جو امر بیل کی طرح ہندوستانی زندگی پر پھیلے جا رہی تھی۔ یہ قوت ایسی تھی کے اعراض و مقاصد ابتداء تجارتی تھے لیکن بعد میں اس نے جہانداری اور ملوکیت کا خوب بھی دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ حیدر آباد، میسور اور اودھ پر تسلط جما لینے کے بعد انگریز عملی طور پر ہندوستان کے بہت سے علاقے کو محکوم بناء چکے تھے۔"(۳)

ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں لکھے ادب میں اس عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی رویوں کی ہمیں بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس دور کے ادبیوں نے بھی ان تبدیلیوں کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں برطانوی استعماری رویے کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ جنہوں اس استعماری رویہ کے خلاف ادب لکھا ان میں سرِ فہرست سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، پریم چند اور سعادت منٹو شامل ہیں۔ پریم چند کو استعماری تحریروں کے رد عمل میں اپنی سرکاری نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ ان ادبیوں نے کھل کر نو آبادیاتی نظام کے خلاف لکھا۔ اسی تناظر میں طاہرہ غفور لکھتی ہیں۔

"ادب میں سر سید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، اکبر الٰہ آبادی، شبلی نعمانی، حالی، کرشن چندر، پریم چند اور سعادت حسن منٹو کی تحریریں نو آبادیاتی اثرات کی عکاسی کرتی ہیں۔ سجاد ظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات" کے پس منظر میں معاشرتی رویے واضح نظر آتے ہیں۔ پروفیسر احمد علی نے "مہاوٹوں کی ایک رات" میں جنس اور غربت پر لکھا۔ ان کے افسانے "قید خانہ"، "غلامی"، "قلعہ" اور "تصویر کے دو رخ" میں بر طانوی سامراجی اثرات ملتے ہیں۔ کرشن چندر کا ناول "شکست" بغاوت اور خود غرضی کے احساسات لیے نو آبادیاتی عہد کا ایک اہم ناول ہے۔"(۴)

جہاں تک آپ بیتیوں کا تعلق ہے تو آپ بیتیوں میں بھی بر طانوی سامراج اور نو آبادکاروں کی تخریب کاری واضح نظر آتی ہے۔ جعفر تھانیسری کی آپ بیتی "کالا پانی" حسرت موہانی کی "قیدِ فرنگ" نواب سرور خان جنگ کی "کارنامہ سروری" رضا علی کی "اعمال نامہ" ظہیر دہلوی کی داستانِ غدر" اور چودھری افضل حق کی "میرا افسانہ" میں نو آبادیاتی نظام کی واضح تصویر نظر آتی ہے۔ ان آپ بیتیوں میں آپ بیتی نگاروں نے اپنے ذاتی زندگی سے زیادہ اپنے عہد کی جھلک پیش کی ہے۔ جس عہد میں یہ آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں اس عہد کو ہم نو آبادیاتی عہد سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان آپ بیتیوں میں نو آبادیاتی عہد کا برصغیر پر سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اثر اور معاشرتی تبدیلیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر مقامی لوگوں کی ذہنی کیفیات، ان کے محسوسات اور قلبی واردات کے اظہار کو سمجھنے کی بھر کوشش کی گئی ہے۔ نو آبادیاتی عہد سیاسی، تہذیبی و معاشرتی اور نظریاتی لحاظ سے ہنگامہ خیز اور انقلاب آفریں عہد تھا۔ اس دور کی آپ بیتیوں میں عہدِ نو آبادیات سے قیام پاکستان تک کی جہد و جہد کے سیاسی، معاشرتی اور تاریخ کے نشیب و فراز اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ میں چوہدری افضل حق کی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں نو آبادیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ چوہدری افضل حق (۱۸۹۱-۱۹۴۲) اردو کے نامور ادیب تھے۔ آپ نہ صرف اردو کے ادیب تھے بلکہ آپ کی حیثیت ایک مفکر اور سیاستدان کی بھی ہے۔ آپ نے اپنی تحریریوں میں انگریزی استعمار کی خامیوں کو کھل کر بیان کیا ہے۔ آپ کی اس آپ بیتی میں لوگوں کے مختلف رویوں، نفسیاتی کیفیات، انسانی شخصیت میں ہونے والی شکست وریخت، ناآسودہ خواہشات اور مغرب کی بے جا تقلید کی تصویر کھینچی ہے۔

اس آپ بیتی میں چوہدری افضل حق نے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کے ساتھ ساتھ نو آبادکاروں کے مظالم، نسلی برتری، غیر انسانی سلوک اور مغربی استحصال کا تذکرہ کھل کر پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے بچپن

کے حالات، ملازمت سے سیاست کی جانب رغبت اور پھر قید و بند کی صعوبتوں کو بڑے دلیرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس آپ بیتی کو پڑھنے کے بعد استعماری رویے کی وجہ سے افضل حق کی ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ انگریزوں نے اپنی نو آبادیوں کو مستحکم کرنے کے لیے مقامی باشندوں پر ظلم و ستم کیے اس کی تصدیق "میرا افسانہ" کرتی ہے۔ اس حوالے سے رانا محمد صفدر ادا اپنے ایم۔فل کے مقالہ "اردو آپ بیتی کی تاریخ" میں لکھتے ہیں۔

> "میرا افسانہ میں افضل حق نے چیدہ چیدہ واقعات کو پیش کیا ہے۔ بچپن کے حالات ،ملازمت سے سیاست کی جانب رغبت اور قید و بند کی صعوبتیں ان سب کو ضروری تفاصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں مصنف کی ذہنی، نفسیاتی، اور جذباتی کیفیات پر روشنی پڑتی ہے۔ مصنف کا نقطہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ انگریزوں کے عتاب سے مسلمانوں کا جو حشر ہوا اس کی تصدیق اس آپ بیتی سے ہوتی ہے۔"(۵)

چوہدری افضل حق ایک سچے وطن پرست انسان تھے۔ آپ کو وطن کی محبت کے عوض بار بار جیلوں میں جانا پڑا۔ سب سے پہلے تو آپ کو تحریک ترک موالات کے سلسلے میں جیل جانا پڑا۔ آپ نے حق اور سچ کی خاطر اپنا تن، من اور دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ آزادی کے لیے اس وقت ہر ایک نوجوان کوشش کر رہا تھا اس کوشش کے بدلے برطانوی استعماری طاقتیں اٹھا اٹھا کر ان نوجوانوں کو جیل میں ڈال رہی تھیں۔ اس وقت ملک ویران اور جیل خانے حق کی بات کرنے والوں سے بھرے جا رہے تھے۔ جیل خانوں میں ایک خاص قسم کی خوبصورتی آنے لگی کیونکہ یہاں وہ لوگ آ رہے تھے جنہوں نے اپنے وطن کی آزادی کی خاطر جان تک کا نذرانہ پیش کرنے سے انکار تک نہیں کیا۔ جو لوگ پابند سلاسل کیے جا رہے تھے وہ اپنے آپ پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ اس حوالے سے چوہدری افضل حق اپنی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں رقمطراز ہیں۔

> "تحریکِ ترکِ موالات جوبن پر تھی۔ آزادی کے دیوانے شمع حق و حریت پر پروانے کی طرح گر رہے تھے۔ احباب ایک ایک کر کے دارالامان میں پہنچ چکے تھے۔ اب سوراج مندر کے باہر رہنا بہادروں کی کسرِ شان تھی۔ ملک ویران اور جیل خانے رشک جنت بن رہے تھے۔ جو پابند کیا جاتا خوش قسمتی پر فخر و ناز کرتا۔ جو باہر رہتا اپنی نامرادی پر سر دھنتا، غرض باہر کا ہندوستان دلچسپیوں سے خالی ہو رہا تھا اور قید خانوں کی کشش بڑھ رہی تھی۔"(۶)

نو آبادکاروں نے اپنے عزائم کو تقویت دینے کے لیے طاقت کا وحشیانہ استعمال کیا۔انھوں نے ہندوستان میں آزادی کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ایک کر تا دھر تا شخص قید کر دیا تا کہ یہ لوگ اپنی آزادی سے محروم رہیں اور بر طانوی استعمار بر قرار رہے۔ تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں نو آبادکاروں نے چوہدری افضل حق کو بھی ۱۴ فروری ۱۹۲۲ء کو گرفتار کیا اور چھے ماہ کی سزا سنائی۔ آپ پر جیل میں بے شمار ظلم و تشدد کیا گیا۔ چوہدری افضل حق کو جیل میں ایسی ایسی سزائیں دی جاتی تھیں جو روح کو تڑپا دینے والی تھیں۔اس تمام بے قراری اور بے چینی کی تصویر آپ کی اس آپ بیتی میں واضح نظر آتی ہے۔اسی تناظر میں رانا محمد صفدر ادار قمطراز ہیں۔

> ""میرا افسانہ" میں جس بے چینی اور تڑپ کا عالم نظر آتا ہے۔اسے اس عہد کی بے قراری کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔وطن سے محبت کے بدلے قید و بند کی صعوبتیں، قیدیوں سے ناروا سلوک اور جیل سے متعلق مصنف کے مشاہدات اس آپ بیتی کے نمایاں پہلو ہیں۔"(۷)

تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں دیگر لوگوں کی نسبت آپ کو ابھی قید نہیں کیا گیا تھا، جبکہ دیگر لوگوں کو دو برس قید میں بیت چکے تھے۔ آپ کو بھی اس گھڑی کا انتظار کہ آپ کو بھی دوسرے لوگوں کی طرح قید کر کے جیل خانے میں لے جایا جائے تا کہ اسے بھی روحانی سکون ملے جس آزادی کی وہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ آخر وہ وقت بھی آ پہنچا جب آپ کو نو آبادکاروں نے قید کر کے پہلی دفعہ تھانہ شکر گڑھ بھیج دیا۔ آپ نے جیل میں جا کر اپنے آپ کو مطمئن اور خوش محسوس کیا۔ آزادی کی خاطر آپ نے قید کو تو گلے لگا لیا لیکن نو آبادکاروں کی غلامی ان سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس حوالے آپ اپنی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں لکھتے ہیں۔

> "دو برس کی مسلسل دعوت اسیری و خواہش پابندی کے باوجود میں ابھی آزاد تھا۔اس لیے دم مغموم و ناشاد تھا۔اپنی شکستہ پائی پر افسوس اور ہم سفروں کے منزل و مقصود تک رسائی پر رشک آتا ہے۔ جس گھڑی کا انتظار تھا وہ آ پہنچی، اور قلعہ پھلور کے ایک ہمدرد اور ہم جلیس سب انسپکٹر پولیس کے ہاتھوں کام سر انجام کو آ پہنچا۔جو ان دنوں تھانہ گڑھ شکر کا افسر انچارج تھا۔ تھانہ میں پہنچ کر میں نے وارنٹ دیکھنا چاہا، تا کہ افسر اجراء کنندہ۔ تاریخ و مقام سماعت کا پتہ چل سکے، مگر میرے دوست سب انسپکٹر نے حق دوستی و قانونی فرض جواب صاف سے ادا کر کے مجھے وہاں داخل کیا۔ جہاں میں اپنی قوت فیصلہ کو کام

میں لا کر خوف و زنداں سے ہراساں و لرزاں انسانوں کو بند کر دینے کا خود حکم دیا کرتا ہے۔"(۸)

آپ نے اپنی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں انگریزی سامراج کے مظالم، سیاسی قیدیوں کے حالات اور تحریکِ ترکِ موالات سے متعلق تمام احوال کو بیان کیا ہے۔ آپ کو جو سزائیں دی گئیں اور بار بار جیل بھیجا گیا اس کا تذکرہ آپ اپنی آپ بیتی میں معمول کے مطابق کرتے ہیں۔ آپ کو حب الوطنی کے جذبے میں بے شمار صدمات کو جھلنا پڑا۔ آپ کو جو جو تکلیفیں، مقدمات اور صدمات برداشت کرنا پڑے ان سب کی تفاصیل آپ نے اپنی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں بیان کیں کی ہیں۔ حسرت موہانی بھی ایک ایسے ادیب جن کو حق کی خاطر انگریزوں نے جیل میں قید کر کے مشقت کروائی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی آزادی کی تحریک کو جاری رکھا اور مرد کامل کی طرح ہمیشہ حق کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ اس حوالے سے رانا محمد صفدر ادا اپنے مقالہ "اردو آپ بیتی کی تاریخ" میں لکھتے ہیں۔

> "میرا افسانہ میں نصف سے زائد واقعات، سیاسی قیدیوں کے حالات، سرگرمیوں اور مصبتیں جھیلنے سے متعلق ہیں۔ تحریک ترک موالات کی زد میں چوہدری افضل حق کو جو سزا ملی وہ اس کا ذکر معمول سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ جذبہ حب الوطنی ہے۔ چوہدری افضل حق کی قید بھی حسرت موہانی کی قید "قیدِ فرنگ" کی طرح ہے۔ لیکن یہ تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کا متوازن انداز میں بیان ہے۔ تاہم جیل سے باہر بسنے والوں کے لیے یہ واقعات غیر معمولی حیثیت کے حامل ہیں۔"(۹)

اس آپ بیتی میں چوہدری افضل حق نے نو آبادکاروں کی تخریب کاری، سیاسی سرگرمیوں اور مسلمانوں پر ظلم و تشدد کی دردناک تصویر کھنچی ہے۔ آپ کو جذبہ حب الوطنی کی وجہ سے انگریز حکومت نے بار بار جیل بھیجا۔ آپ نے جیل میں جن روح فرسا مظالم کا مشاہدہ کیا تو ان سے متاثر ہو کر "دنیا میں دوزخ" کے عنوان سے آپ نے ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ آج جیل خانہ جات میں جو اصلاحات نظر آتی ہیں وہ بھی چودھری افضل حق کی کوششوں کی مرہون منت ہیں۔

آپ نے بھی اس استعماری حکومت کے ہتھ کنڈوں کے خلاف پُر زور احتجاج کیا۔ یہاں تک کہ آپ کو چار بار جیل جانا پڑا اور حق کی خاطر آپ جیل میں بڑی خوشی سے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ جب آپ کو مجسٹریٹ کے سامنے رہائی اور سزا کے سلسلے میں پیش کیا گیا تو آپ نے ان آبادکاروں کے خلاف برملا کہہ دیا کہ حکومت وقت کے

خلاف نافرمانی کا مرض مجھ میں زیادہ ہے اس کی سزا مجھے آپ جتنی دے سکتے ہیں دیں تا کہ اس مرض سے مجھے ہمیشہ کے لیے شفا مل جائے۔ اسی تناظر میں آپ اپنی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں لکھتے ہیں۔

> "مجھ سے مجسٹریٹ نے پوچھا کہ کتنی سزا دوں۔ جواب دیا کہ حکومت کی نافرمانی کے مرض کی شدت ہے۔ اگر سزا اس مرض کی دوا ہے تو پوری خوراک دیجیے۔ مجسٹریٹ نے ہنس کر کہا نہیں کم از کم سے شروع کیجیے۔ یعنی چھ ماہ تک جیل جاترا۔ وکلاء میں سے چند ایک نے پوچھا کہ قید محض ہے یا سخت، کہا جیسا ان کا بخت۔"(۱۰)

اس آپ بیتی میں چوہدری افضل حق نے نو آبادیاتی عہد کو مخصوص سیاسی و سماجی تناظر میں دیکھا۔ یہ آپ بیتی نو آبادیاتی عہد کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس آپ بیتی میں نو آبادیاتی نظام سے پیدا شدہ واقعات و سانحات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تہذیبی تبدیلیوں کا ہندوستانی معاشرے کا بطور خاص ذکر ملتا ہے۔ یہ آپ بیتی اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ اپنے موضوع کے پھیلاؤ کی وجہ سے نو آبادیاتی عہد کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے آنے کی وجہ سے ہندوستان کے لوگ اس جدید نظام کے آہستہ آہستہ دلدادہ ہونے لگے۔ مسلمانوں کی اپنی کوئی سیاسی پالیسی نہ تھی اس لیے بدیسی اس سے اپنا فائدہ اٹھا کر اس پر قابض ہو گئے۔ ہندوستان کی عوام میں بھی اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس نئی حکومت کے خلاف کوئی رد عمل ظاہر کریں۔ مقامی لوگوں نے نو آبادیاتی نظام کو غنیمت سمجھا اور اس کی پیروی شروع کر دی۔ غلامی نے ہندوستانی مسلمانوں کو بے جان کر دیا۔ ہندوستان کے حکمرانوں نے انگریزی استعمار کی سیاست کا خیر مقدم کر کے ان سے ناطہ جوڑ لیا۔ اسی تناظر میں چوہدری افضل حق لکھتے ہیں۔

> "غلام ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی سیاسی پالیسی نہ تھی۔ مسلمان امراء، علماء اور صوفیانہ خدا سے منہ موڑ کر انگریز سے ناطہ جوڑے ہوئے تھے۔ وہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑنے کی دعائیں تو کرتے تھے لیکن انگلستان کے خلاف حرف شکایت زبان پر لانے کی تاب نہ رکھتے تھے۔"(۱۱)

نو آبادکاروں نے ہندوستان میں جو سہولیات مہیا کیں وہ ایسی نوعیت کی تھیں جس سے مقامی لوگوں کو نہیں بلکہ خود نو آبادکاروں کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ نو آبادکاروں نے اپنی ہر سہولت کے سامنے اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر کام کرنا شروع کیا تھا۔ نو آبادکار مقامی باشندوں کی ذہن سازی اس طرح کرتے ہیں کہ گویا لگتا ہے کہ یہ تمام پالیسیاں ہندوستان کے لوگوں کے حق میں ہیں۔ نو آبادکاروں کی جو ایک غاصبانہ ذہنیت تھی اس کے پیچھے بہت سے مقاصد کار فرما ہوتے تھے۔ اس مقصد میں مقبوضہ ملک کا دولت و سرمایہ لوٹ کر اپنے ملک کو معاشی طور پر مضبوط کرنا سرِ فہرست ہے

۔اس کے علاوہ نو آبادیاتی باشندوں پر حکومت کرنا بھی ایک اہم مقصد تھا۔ نو آبادکار ہر حوالے سے نو آبادیاتی باشندوں کو بے بس اور مجبور کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ نو آبادکاروں نے جس طرح برصغیر کے رسم ورواج، تہذیب وثقافت، زبان وادب اور تعلیم پر گہری چھاپ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اس کی ساری تصویر "میرا فسانہ" میں ہمیں نظر آتی ہے۔ نو آبادیاتی نظام اپنے ایک خاص اصول کے تحت کام کرتا ہے۔ نو آبادیاتی باشندوں کی بے بسی و مجبوری اور نو آبادکاروں کے مقاصد کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال اپنے مضمون "نو آبادیات ومابعد نو آبادیات" میں لکھتے ہیں۔

> "نو آبادیاتی صورت حال پیدا کرنے کے سبب کے پیچھے طاقت ور قوم کے غاصبانہ قبضہ کرنے کی ذہنیت کارفرما ہوتی ہے۔ نو آبادکار جب کسی قوم اور ملک کو اپنی نو آبادیات بنالیتا ہے تو وہاں کے رسم ورواج، تہذیب و ثقافت، زبان اوادب اور تعلیم پر اپنی گہری چھاپ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ساری صورت حال کا مقصد نو آبادکار کے اختیار اور دائرہ کار کو بڑھانا اور نو آبادیاتی باشندوں کو ہر حوالے سے مجبور بے بس بنانا ہوتا ہے۔"(۱۲)

چوہدری افضل حق نے اپنی اس کتاب میں آپ بیتی بیان کرنے کے پردہ میں نو آبادیاتی نظام کی تمام قباحتوں کو ایک خاص انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ کو نو آبادی باشندوں نے وطن پروری، غریب پروری اور ادب پروری کی وجہ سے چار مرتبہ گرفتار کیا اور جیل میں ڈال کر سزائیں دیں۔ جہاں پر یہ کتاب مصنف کے ذاتی احوال، طبعی رجحانات، اور فکری میلانات کا حسین مرقع ہے۔ وہیں پر یہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی رویوں کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ آپ نے اپنی اس آپ بیتی میں نو آبادیاتی عہد کی سیاسی اور سماجی تمام تاریخ کو بلا مبالغہ رقم کیا ہے۔ یہ ایک آپ بیتی کے ہونے ساتھ ساتھ برصغیر کی نو آبادیاتی عہد کی تاریخ بھی ہے۔ آپ نے ایک غیر جانبداری کے ساتھ انگریز استعمار کی خوبیوں خامیوں کو اپنی اس کتاب "میرا افسانہ" میں پیش کیا ہے۔ جب آپ کئی مرتبہ جیل گئے تو آپ نے مناسب سمجھا کہ جیل میں چند اصلاحات نافذ کروانے کی بھرپور کوشش کی۔ آپ نے ہر دفعہ اور ہر موڑ پر جیل میں سیاسی اسیروں کے لیے بہتری کی کوشش کی۔ آپ کے ساتھ کے سیاسی قیدیوں نے بھی ان اصلاحات کو لاگو کروانے کی بھر کوشش کی ہے ۔اسی تناظر میں آپ اپنی اس تصنیف میں رقمطراز ہیں۔

> "جیل کی تحقیقاتی کمیٹی نے شملہ جانے سے پہلے جیل کی مجوزہ اصلاح کا عام خاکہ تیار کر دیا تھا۔ جب اسے سیاسی اسیروں کو دکھایا گیا۔ تو ان میں سے بھگت سنگھ نے اس کی خامیوں کو

بھانپ لیا اور ہم پر صاف طور سے واضح کر دیا کہ یہ خاکہ موجودہ صورت میں قطعی نا تسلی بخش ہے۔"(۱۳)

نو آبادیاتی عہد میں سیاسی و سماجی اہم فیصلے ہوئے ان تمام احوال کا تذکرہ چوہدری افضل حق نے اپنی اس آپ بیتی میں کھل کر پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں جتنے بھی اہم سیاسی فیصلے ہوئے انگریزی استعمار کے زیر اثر ہوئے ان تمام کی صحیح صورت حال ہمیں چودھری افضل حق کی اس آپ بیتی میں نظر آتی ہے۔ نو آبادکاروں نے بر صغیر پر ظلم و تشدد، نسلی برتری، انسانی استحصال، دولت کی لوٹ اور مقامی لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھنے جیسے مقاصد تک اپنے آپ کو محدود رکھا۔ انگریز حکومت نے جو ہندوستانی عوام کی تقدیر کے فیصلے کیے لوگوں کو ان فیصلوں میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ نو آبادکاروں نے اپنی طاقت کا وحشیانہ استعمال کر کے مقامی لوگوں کے حقوق و وسائل کا استحصال کیا۔ سائمن کمیشن کے فیصلے کو ہی دیکھ لیجیے ہندوستانی عوام کس طرح اس بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی عوام کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر اپنی مرضی کے مطابق حکمرانی کرنے کی کوشش ہمیشہ جاری رکھی۔ اس تناظر میں چوہدری افضل حق اپنی اس آپ بیتی "میرا افسانہ" میں لکھتے ہیں۔

> "سائمن کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شریک نہ کر کے انگریزی حکومت نے ہندوستان کی سیاسی بیچارگی کا اعلان کیا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ انگلستان ہندوستان کی ۲۴ کروڑ بھیڑ بکریوں پر اپنی مرضی کے مطابق حکمرانی کرے گا۔ انہیں کمیشن سے باہر رہ کر بے معنی فریاد کا حق ہے۔ لیکن آئین کی تشکیل میں ہندوستان کو دخل نہ ہو گا۔"(۱۴)

یہ وہ تمام صورت حال تھی جو مغربی استعمار کے زیر سایہ اس وقت پنپ رہی تھی۔ نہ صرف عام لوگوں بلکہ سیاسی اور سماجی کارکنوں سے لے کر ایک عام شخص تک نے اس نو آبادیاتی نظام کے خلاف آواز بلند کی۔ لیکن افسوس صد افسوس ہندوستانی عوام سے کچھ بھی نہ بن سکا وہ ان نو آبادکاروں کے آگے بے بس اور مجبور ہو گئے۔ نو آبادکاروں نے بر صغیر کا دولت اور سرمایہ خوب لوٹا کر اس کو خالی کر دیا۔ نو آبادکاروں نے ظلم و تشدد کی کہانیاں رقم کیں اور ان کے خلاف جن لوگوں نے رد عمل کیا انھوں نے ان کو بھی اپنے مفادات کی خاطر جیل میں ڈال دیا۔ نو آبادیاتی نظام کے خلاف نہ صرف چوہدری افضل حق نے بلکہ ہمارے دیگر آپ بیتی نگاروں نے بھی اس کا رد عمل ظاہر کیا تو ان کو بھی طویل اور مختلف قسم کی سزائیں برداشت کرنا پڑیں۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے بھی اپنی آپ بیتی "کالا پانی" میں نو آبادکاروں کے ظلم و تشدد کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"بارہویں دسمبر کو جب سپرنٹنڈنٹ پولیس میرے خطوط اور آدمیوں کو جو میرے گھر سے ملے تھے۔انبالہ کو لے گئے تو ان کو دیکھ کر بعد حصول منظوری گورنمنٹ میری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا،وہی پارسن صاحب دوسرے دن میری گرفتاری کا وارنٹ لے کر تھانیسیر آیااور مجھ کو وہاں نہ پاکر شہر میں آفت مچادی۔ سینکڑوں گھروں کی تلاشی ہوئی۔پچاسوں مرد عورت پکڑے گئے۔میری بوڑھی والدہ اور میرے بھائی محمد سعید کو بارہ تیری برس کا تھااور اس کی بیوی کو قید کر کے ان پر سخت عذاب اور مار پیٹ شروع کی اور ایسا ظلم اور بے عزتی عوراتِ پردہ کی ہوئی کہ جس کو سن کر دل کانپ جاتا ہے۔"(۱۵)

جعفر تھانیسیری نے بھی اپنی آپ بیتی میں نو آبادکاروں کے مظالم کو کھل کر اور بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ کو بھی چوہدری افضل کی طرح انگریزوں نے مختلف قسم کی اذیتیں دیں۔قید میں آپ پر بہت ظلم و تشدد کیا گیا جس کی مثال ملنا محال ہے۔ آپ کو انگریزوں نے کالے پانی کی سزا دی اور جیل میں ایسی سزائیں دیں جس کے بارے میں انسان سن کر حیرت میں پڑ جاتا ہے۔اس وقت انگریز استعمار نے سزا کے بھی عجیب رنگ ڈھنگ نکالے ہوئے تھے مثال کے طور پر وہ قیدیوں کا ماتھا کھود کر ان کی پیشانی پر ان کا نام اور ان کا جرم لکھ دیتے تھے۔نو آبادیاتی عہد میں ہندوستان کے لوگوں کو اس قسم کی سزائیں واسطہ پڑا۔

اٹھارویں صدی ہی سے برصغیر میں افراتفری اور سیاسی کمزوریاں شروع ہو چکی تھیں۔جب انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو اس وقت تو مکمل طور پر برصغیر پر نو آبادکار گرفت حاصل کر چکے تھے۔انگریزوں نے آہستہ آہستہ ہندوستان میں کالونیاں بنانا شروع کر دیں۔کالونیاں بناتے ہی انھوں نے نو آبادیاتی تمدن مسلط کرنے کی بھر کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔استعماری نمائندوں نے اپنی ثقافت جب اپنی کالونیوں پر مسلط کرنا شروع کی تو آہستہ آہستہ مقامی لوگ نے بھی اس کو اپنانا شروع کر دیا۔اس طرح مقامی باشندے اپنی ثقافت سے دور ہو کر استعمار کار کی ثقافت کو اختیار کرنے میں فخر اور خوشی محسوس کرنے لگے اس طرح برطانوی استعماری نمائندوں کی محنت خود بخود رنگ لانے لگیں۔اسی تناظر میں ریاض ہمدانی اپنی کتاب "اردو ناول کا نو آبادیاتی" مطالعہ میں رقمطراز ہیں۔

"برصغیر انیسویں صدی کے آغاز میں ہی نو آبادیاتی ملک بن چکا تھا۔اٹھارویں صدی بھی انتشار،سیاسی کمزوری اور اخلاقی انحطاط کی صدی تھی۔انگریزوں نے جب ہندوستان کو کالونی(Colony) بنا لیا تو اس پر "نو آبادیاتی "تمدن مسلط کر دیا۔استعمار کار (Colonizer)اپنی ثقافت اپنی کالونی (Colony)پر مسلط کرتا ہے۔جس کے نتیجے

میں مقامی باشندہ اپنی ثقافت سے دور ہو جاتا ہے اور استعمار کار کی ثقافت کو اپنانے یا اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔"(۱۶)

نو آبادکار نے "نو آبادیاتی تمدن "مسلط کرنے کے علاوہ جو بھی نو آبادیاتی نظام کے رائج کرنے کے لیے جو حکمتِ عملیاں، تدبیریں اور سازشیں اپنائی ان سب احوال کا جائزہ "میرا افسانہ "پیش کرتی ہے۔"میرا افسانہ "میں چودھری افضل حق نے نو آبادکاروں کے ظلم و ستم، نسلی برتری، حقوق و وسائل کا استحصال اور انسانی اقدار کی پامالی کی تصویر پیش کی ہے۔ انگریز نے کوشش شروع ہی دن سے اپنی جاری رکھی کہ ہندوستان کے لوگوں کو غلام بنایا جائے وہ آخر کامیاب ٹھہری۔ انھوں نے بہت عرصہ تک اپنا تسلط قائم رکھا۔ ہندوستان کے جو لوگ انگریزوں کی دوستوں سے مستفید ہوتے رہے ان کا انجام آخر کار بہت دردناک اور مہلک ثابت ہوئیں۔ وہ استعماری طاقت کے ہاتھوں صرف ایک منہ کھولنے کی حیثیت رکھتے تھے۔ نئے حکمرانوں کی دوستی اور دشمنی دونوں کا انجام تختہ سے تختہ تک محدود تھا۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنی شہرہ آفاق تصنیف "آزادی میں اردو کا حصہ "میں لکھتے ہیں۔

"انگریز نے ابتداء ہی سے یہ کوشش روا رکھی تھی کہ کسی طرح اپنے مفاد کے لیے ہندوستان پر تسلط قائم کریں۔ جو رساء اور حکمران انگریز کی دوستی سے مسحور ہوئے ان کے لیے یہ دوستی کا انجام کار مہلک ثابت ہوئی ان میں سے ہر ایک کو تخت حکومت سے اترنا پڑا یا وہ اس طاقت کے ہاتھوں بے جان کھلونا بن کر رہ گئے۔ ان حکمرانوں نے چاہیے دوستی کی راہ اختیار کی یا دشمنی کی، نتیجہ دونوں حالتوں میں یکساں نکلا۔ اگر انھوں نے غاصب انگریزوں کے ساتھ تعلقات گوارانہ کیے تو ان پر ارادہ ہائے بد کا الزام لگا کر حملہ کر دیا گیا اور ان کے علاقے مسخر کر لیے گئے اور اگر انھوں نے پیش کردہ دوستی قبول کر لی تو وہ انگریزی حکمت عملی کے جال میں اس طرح الجھ گئے کہ وہ اپنی عزت اور مورثی مقبوضات سے محروم ہوئے۔ چنانچہ وہ لوگ جہاں حکومت کرتے رہے تھے قیدی بن کر رہ گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کو ایک دوسرے کے خلاف لڑائی کے لیے آمادہ کر دیا جاتا، ایک کو مدد دے کر کامیاب کیا جاتا پھر غلط روی کا الزام لگا کر دوسرے کو تخت سے اتار دیا جاتا۔"(۱۷)

نو آبادکار اپنی تمام تر پالیساں لاگو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مقامی لوگوں نے بھی وقت کے ساتھ ساتھ غالب ثقافت کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ مقامی باشندوں میں زیادہ تر اکثریت ان لوگوں کی تھی جو پڑھا لکھا طبقہ تھا

اور نئی نئی چیزوں کی طلب رکھتا تھا۔ انسان کوئی بھی کام دو صورتوں میں سر انجام دیتا ہے پہلی مرتبہ اپنی ضرورت پوری کرنے کی خاطر اور دوسری مرتبہ اپنی زندگی میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے۔ نو آبادکاروں نے بھی کچھ اس طرح کی پالیسی کو اپناتے کمزور ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ نو آبادکاروں نے جو عمل یا طریقہ اپنے مفاد کی خاظر اپنایا، اور جو اس نو آبادیاتی نظام کو لاگو کرنے کے لیے مقامی لوگوں کا ہر حوالے سے استحصال کیا اس تمام احوال کی صحیح تصویر چوہدری افضل حق کی آپ بیتی "میرا افسانہ" پیش کرتی ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں استعمار کے رد عمل میں اظہار کرنے والوں میں چوہدری افضل حق بھی شامل تھے۔ آپ کو تحریک آزادی کی خاطر کئی مرتبہ جیل میں ڈالا گیا۔ مغربی سامراجیوں نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا تھا تاکہ مسلمان سیاسی، مذہبی، تہذیبی ہر لحاظ سے غلام بن جائیں اور ان کا منفرد وجود باقی نہ رہے۔ زیر نظر مقالے کا یہ مقصد ہے کہ اردو زبان اور ادیبوں نے مسلمانوں کی ملی تحریکات کے فروغ اور مسلمانوں میں ملی شعور کو بیدار کرنے اور ان کی سیاسی تحریکات کو مضبوط کرنے میں کیا خدمات سر انجام دیں، جس سے نو آبادیاتی نظام کی جڑیں کمزور ہوئیں ہو اور ہندوستان کی عوام کو فائدہ حاصل ہوا۔

حوالہ جات

۱۔ طاہرہ غفور ، "بانو قدسیہ کے افسانے "کلو" کا مابعد نو آبادیاتی تناظر میں تجزیہ "مشمولہ: معیار شمارہ نمبر، ۲۴، جولائی تا دسمبر ۲۰۲۰، مدیر ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، ص ۱۶۶

۲۔ ایضاً: ص: ۱۶۶

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر "اردو ادب کی تحریکیں" انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۵۹

۴۔ طاہرہ غفور ، "بانو قدسیہ کے افسانے "کلو" کا مابعد نو آبادیاتی تناظر میں تجزیہ "ایضاً، ص ۱۶۶

۵۔ رانا محمد صفدر ادا، "اردو آپ بیتی کی تاریخ آغاز سے ۱۸۵۷ء تک "(مقالہ برائے ایم۔ فل اردو)، علامہ اقبال اوپن، یونی ورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۶۴

۶۔ افضل حق، چوہدری، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص: ۶۷

۷۔ رانا محمد صفدر ادا، "اردو آپ بیتی کی تاریخ آغاز سے ۱۸۵۷ء تک، ایضاً ص ۶۵

۸۔ افضل حق، چوہدری، ایضاً: ص، ۶۷

۹۔ رانا محمد صفدر ادا، "اردو آپ بیتی کی تاریخ آغاز سے ۱۸۵۷ء تک، ایضاً ص ۶۵

۱۰۔ افضل حق، چوہدری، ایضاً: ص، ۷۵

۱۱۔ ایضاً: ص، ۲۷

۱۲۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، نو آبادیات ومابعد نو آبادیات، مشمولہ (نو آبادیات و مابعد نو آبادیات) مرتب، محمد عامر سہیل، عکس پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۹ء ص، ۱۲۳

۱۳۔ افضل حق، چوہدری، ایضاً، ص، ۱۵۳

۱۴۔ ایضاً: ص، ۱۴۸

۱۵۔ جعفر تھانیسیری، کالا پانی، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص، ۱۵

۱۶۔ ریاض ہمدانی، ڈاکٹر اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ، ۲۰۱۸، لاہور، فکشن ہاوس، ص ۱۲۰

۱۷۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، آزادی میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۶، ص، ۳۳، ۳۲

References in Roman

1. Tahira Ghafoor, Bano Qudsiya Kay Afsany "Kallo"ka Maabaad Nowabaadiyati Tanzur Mein Tajziya " Mashmoola Meyar Issue 24, July to December, Editor Dr Abdul Aziz Ibin ul Hassan, International Islamic University, Islamabad, P.166
2. Ibid, P.166
3. Anwar Sadeed, Dr, Urdu Adab ki Tehreekein, Anjuman Taraqqi e Urdu, Karachi, 2004, P.259
4. Tahira Ghafoor, Bano Qudsiya Kay Afsany "Kallo"ka Maabaad Nowabaadiyati Tanzur Mein Tajziya "Islamabad, P.166
5. Rana Muhammad Safdar Ada, Urdu Ap Beeti Ki Tareekh Aghaz sy 1857 Tak, (Mphil Thesis), AIOU, Islamabad, 1992,P.64
6. Afzal Haq Choudhary, Zahid Basheer Printers, Lahore, 2000, P.67
7. Rana Muhammad Safdar Ada, Urdu Ap Beeti Ki Tareekh Aghaz sy 1857 Tak, ,P.64
8. Afzal Haq Choudhary, P.67
9. Rana Muhammad Safdar Ada, Urdu Ap Beeti Ki Tareekh Aghaz sy 1857 Tak, ,P.64
10. Afzal Haq Choudhary, P.67
11. Ibid, 27
12. M.Ashraf Kamal,Dr,Now Abdiyat o Mabaad Now Abadiyat, Murattaba, Muhammad Amir Sohail,Aks Publications, Lahore,2019, P.123
13. Afzal Haq Choudhary, P.153
14. Ibid, 148
15. Jafar Thansairi, Kala Pani, Sang e Meel Publication, 2012, P.15
16. Riaz Hamdani, Dr,Urdu Novel ka Nowabaadiyati Mutala, Fiction House,Lahore, 2018P.120
17. Moin Ud Din Aqeel, Dr, Azaadi Mein Urdu Ka Hissa, Anjuman Taraqqi e Urdu, 1976, P.32-33

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.274

فرزانہ رانی

پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد

شعبہ اُردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور۔

"صحیفہ "کا سر سید احمد خاں نمبر۔۔۔۔ تجزیاتی مطالعہ

Farzana Rani
Scholar Ph.D Urdu Department, Allama Iqbal Open University, Islamabad.
Dr. Rafaqat Ali Shahid
Department of Urdu, Lahore Garisson Universit, Lahore.

An Analytical Study of Sir Syed Ahmad Khan Number of "Saheefa"

ABSTRACT

"Saheefa" is renowned research journal of Pakistan. Scholars need to consult its contents for seek of knowledge, literary taste and to flourish their researches, and a reader can get a pleasant food of knowledge as well. Since 1956, the year of its beginning, "Saheefa" get and has been maintaining a graceful status of a research journal. It has been publishing valuable research works during his 65 years life. "Saheefa" is also in practice of publishing its special numbers on special events and personalities accordingly, presenting their works and services appraise worthy.

Keywords: *Special, Issue, Flourish, Personality, Literature, Services, Subcontinent, Angles.*

برصغیر کے عظیم مدبر سر سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔[1] سر سید احمد خاں سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی دست گیری کی اور اپنی تخلیقات سے مسلمانوں

Received: 08th Aug, 2022 | Accepted: 10th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی اصلاحی کوششوں کو علی گڑھ تحریک کا نام دیا گیا۔

سرسید احمد خاں پہلے مسلمان دانش ور تھے جنھوں نے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ "اور" تہذیب الاخلاق" جیسے اصلاحی اور ادبی جرائد شروع کیے۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانان ہند کی اصلاح اور ترقی کے لئے پرخلوص کوششیں کیں وہ کسی تحریک سے کم نہیں۔

علی گڑھ تحریک کے دیگر قائدین میں محسن الملک، وقارالملک، مولانا شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی اور مولانا چراغ علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شخصیات نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ہم ان کی جتنی بھی قدر کریں کم ہے۔ سرسید احمد خاں اور اُن کے ساتھیوں نے علی گڑھ تحریک کو موثر تحریک بنادیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اس کے لئے انھوں نے مسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے کے لئے سہولتیں فراہم کیں۔ مسلمانوں کو سائنسی اور فنی علوم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا جدید دور میں ترقی کیلئے ضروری ہے۔ اسی غرض سے سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۸ میں مرادآباد میں فارسی مدرسہ قائم کیا اور ۱۸۶۴ میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ (۲)

ان تعلیمی اداروں میں فارسی کے علاوہ انگریزی زبان اور جدید علوم پڑھانے کا بندوبست بھی کیا۔ اس کے بعد ۱۸۷۵ میں مدرستہ العلوم علی گڑھ میں قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ کالج بنا اور ان کی وفات کے بعد ۱۹۲۰ میں یونیورسٹی کا درجہ اختیار کر لیا گیا ہے۔ (۳)

مجلس ترقی ادب نے سرسید احمد خاں کی دوصد سالہ سال پیدائش کی مناسبت سے "صحیفہ" کی ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جو جولائی ۲۰۱۷ سے ستمبر ۲۰۱۸ کے شمارے کی صورت میں منظر عام پر آئی۔ اس خاص شمارے کا سرورق جاذب نظر ہے۔ سرسید احمد خاں کا قلمی خاکہ نمایاں ہے یہ ۷۰۷ صفحات پر مشتمل خاص شمارہ ہے۔ سرورق کے آخری صفحے پر سرسید کے دو خطوط کے عکس بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ان دونوں التزامات سے اس خاص شمارے کی وقعت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

"صحیفہ" کا سرسید نمبر ضخیم شماروں میں اہم تر ہے۔ اس شمارے کے ۷۰۷ صفحات ہیں ۲۹ صفحات زائد ہیں جو آرٹ پیپر پر ہیں اور ان صفحات میں سرسید کی کچھ کتابوں کے سرورق اور کچھ قلمی تحریروں کے عکس شائع کیے گئے ہیں۔ اس شمارے میں ۵۰ مقالات و مضامین شامل ہیں ان میں سے ۱۶ مضامین تازہ ہیں جبکہ ۳۴ مقالات و مضامین پہلے سے شائع شدہ ہیں۔ یوں مدیر نے قدیم و جدید کی دلکش آمیزش سے ایک خوبصورت گل دستہ ترتیب دیا ہے۔ اس خاص شمارے کی پیش کش بھی دیدہ زیب ہے۔ اس شمارے کی مجلس ادارت میں ڈاکٹر تحسین فراقی (صدر مجلس اور

مدیر اعلیٰ) افضل حق قرشی (مدیر) اور محمد ظہیر بدر (معاون مدیر) کے نام شامل ہیں۔ اس شمارے کے تازہ مضامین میں مدیر اعلیٰ اور مدیر کے بالترتیب ایک اور دو مقالے شامل ہیں۔ مدیر نے سرسید احمد خاں کی توقیت لکھی ہے۔[۳]

اس خاص شمارے میں یوں تو سارے مضامین و مقالات اپنی جگہ اہم ہیں لیکن اس مختصر مقالے میں سب کا جائزہ لینا ممکن نہیں اس لیے درج ذیل میں چند مضامین و مقالات کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا اور کچھ کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے اس سے سرسید نمبر کی اہمیت واضح ہو گی۔

مدیر اعلیٰ نے سرسید احمد خاں پر ادارتی معروضات کے ساتھ ساتھ سرسید پر اپنے مقالہ "سرسید" چند معروضات اور ان کے دو غیر مطبوعہ مکتوب کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس مقالے میں سرسید کے دو خطوط شائع کیے گئے ہیں جو انہیں محمد سلیم الرحمٰن کے توسط سے حاصل ہوئے۔ یہ دونوں خط مولوی احمد بابا مخدومی کے نام ہیں اور پوسٹ کارڈ کی صورت میں ہیں۔ پہلا خط ۱۱۶ اکتوبر ۱۸۹۳ کا ہے اور دوسرا سرسید کی وفات سے دو سال پہلے کا ہے یعنی ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ کا دونوں خطوط پر احمد بابا مخدومی کا لاہور کا پتہ انگریزی میں تحریر ہے۔ اس پتے کے اوپر کی جانب جلی حروف میں ایسٹ انڈیا پوسٹ کارڈ East India Post Card کارڈ لکھا ہوا ہے۔[۵]

پوسٹ کارڈوں پر لگی ثبت مہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ میں کمپنی کی حکومت تو ختم ہو گئی تھی لیکن چالیس برس تک ڈاک خانوں کی مہروں اور کارڈوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام درج ہوتا رہا۔ پہلا خط جو ۱۸۹۳ میں لکھا گیا اس میں بابا مخدومی کو ان کے ہاں فرزند کی پیدائش پر مبارک باد دی گئی ہے۔ دوسرے خط میں نزول مسیح اور ظہور مہدی پر سرسید نے اپنا موقف بیان کیا ہے۔[۶]

نامور محقق ارشد محمود ناشاد کا مقالہ "مسدس حالی" "سرسید احمد خاں اور فیروز الدین فائض" میں مسدس حالی کا ان کے مطابق خاص طور پر ذکر ہے۔ جس میں مسلمانوں کی زبوں حالی بیان کی گئی ہے۔ "مسدس حالی" پہلی بار جمادی الثانی ۱۹۹۶ بمطابق جون ۱۸۷۹ میں مطبع دہلی میں مولانا حالی کی زیر نگرانی شائع ہوئی ہے۔[۷] مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ مسدس کے چھپتے ہی حالی نے اس کا نسخہ سرسید احمد خاں کو ارسال کیا سرسید احمد خاں نے اس انقلابی تخلیق کو یوں خراج تحسین پیش کیا!

> "بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ
> جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا؟ تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں"[۸]

مقالہ نگار نے واضح کیا ہے کہ مسدس حالی کے فارسی، عربی، انگریزی، روسی، بنگالی، گجراتی، کشمیری، پنجابی، سندھی اور پشتو زبانوں میں تراجم اور تشریحات بھی سامنے آئیں۔ "مسدس حالی" کا سب سے پہلا ترجمہ فارسی میں ہوا۔

جو مولوی فیروزالدین شہ میری پنجاب کی ایک ریاست نورپور ضلع کانگڑا کے رئیس اور کشمیر ہائیکورٹ کے وکیل تھے۔ ان کی پیدائش امرتسر کی ہے۔ (۹)

فائض شہ میری چونکہ "مسدس حالی" سے بہت متاثر ہوئے تھے اور مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے جب وہ کشمیر ہائیکورٹ کے وکیل مقرر ہوئے تو اُن کے دل میں خیال آیا کہ کشمیری لوگ اردو زبان سے نابلد ہیں۔ اس لیے انہوں نے مسدس حالی کو فارسی زبان میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے مولانا حالی سے اجازت کے لئے سرسید احمد خاں سے مشورہ کیا۔ مولوی شہ میری کو اجازت تو مل گئی لیکن سر سید احمد خاں نے اُن کو اس کام سے باز رہنے کا مشورہ دیا جو کہ اُن کو پسند نہ آیا۔ اُن کے منع کرنے کے باوجود مولوی فیروزالدین شہ میری نے مسدس حالی کا فارسی ترجمہ کیا جو ۱۸۹۰ میں "مسدس فائضی" کے نام سے اختر ہند پریس سے شائع ہوا۔ (۱۰) اس مقالے میں مولوی فیروزالدین اور سرسید احمد خاں کے مکتوبات کا بھی ذکر ہے۔

اس خاص شمارے کا ایک اہم مقالہ میں شبلی نعمانی کا "سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر" ہے۔ اس مقالے میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں ایک مصلح مصنف ہیں اور مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں درد رکھتے ہیں۔ سرسید نے عشق وعاشقی کے مضامین کے بجائے اصلاحی، تاریخی، اخلاقی، سائنسی، معاشرتی غرض ہر قسم کے مضامین لکھ کر اردو ادب کو وسعت دی۔ اس کے علاوہ سرسید احمد خاں نے شاعری کے میدان میں بھی قدم رکھا اور آہی تخلص اختیار کر کے ایک چھوٹی سی مثنوی بھی لکھی۔

"نام میرا تھا کام اُن کا تھا" (۱۱)

چوں کہ یہ سرسید کا میدان نہیں تھا اس لیے جلد ہی انہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ سرسید نے دلی کی تاریخ اور عمارتوں پر ایک کتاب "آثارالصنادید" لکھی جو ۱۸۴۷ میں شائع ہوئی اس زمانے میں انشاپردازی کا رواج عام تھا۔ اس لیے "آثارالصنادید" کی زبان اور اسلوب اسی طرز میں تھا۔ بعد میں اس اسلوب پر نظر ثانی کر کے انہوں نے پوری کتاب کا اسلوب بدل دیا۔ اُسی دور میں اردو اخبارات نکلنا شروع ہوئے تھے چنانچہ سرسید اور ان کے بڑے بھائی نے بھی سید الاخبار کے نام سے ایک اخبار نکالا بعد ازاں مسلمانوں کی حالت سنوارنے کے لیے سرسید نے "تہذیب الاخلاق" شروع کیا۔ اس مقالے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سرسید احمد خاں نے انشاپردازی کیلئے جو اصول مرتب کیے وہ انگریزی سے لیے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی کے اصلاحی مضامین کو اردو میں ڈھالا ترجمہ کے ذریعے نہیں بلکہ انگریزی مضامین کے خیالات کو اردو میں اپنے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ مولانا شبلی کے مطابق سرسید کی انشاپردازی کا کمال یہ ہے کہ وہ جب کسی علمی مسئلے پر بحث کرتے ہیں کہ تو مشکل سے مشکل بحثوں کو

اس طرح آسانی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی دقیق بحث نہیں پڑھ رہا بلکہ ایک دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

آل احمد سرور کا مقالہ سرسید کے ایک مخالف (مولوی علی بخش خاں شرر) پر لکھا گیا ہے۔ ان کے مطابق سرسید احمد خاں کو ایک بہت بڑا مدبر سمجھا جاتا ہے جس نے سوئی ہوئی مسلمان قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی جس میں سرسید احمد خاں کو بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ سرسید یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے مخالفین ترقی و تعلیم کے مخالف ہیں بلکہ وہ سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریہ کے خلاف تھے۔ اس مضمون میں جن مخالف کا ذکر ہے وہ سید الحاج مولوی علی بخش خاں شرر بدایوانی تھے۔ مولوی علی بخش جس گھرانے میں پیدا ہوئے تھے وہاں جدت کو بدعت کہا جاتا تھا۔ سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" میں آدم کی سرگذشت مضمون لکھا جس کے جواب میں علی بخش نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "شہاب ثاقب" ہے۔ انہوں نے جدید اور قدیم کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ (۱۲)

معین الدین عقیل نے اپنے مضمون "سرسید کا سب سے اہم کارنامہ" میں لکھا ہے کہ سرسید نے اپنے علمی بصیرت سے مسلمانوں کی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کو متاثر کیا۔ انہوں نے تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ بعض علمی اور سماجی ادارے بھی قائم کے۔ جن میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور محمڈن ڈیفینس ایسوسی ایشن کی تشکیل کی جن کے ذریعے انہوں نے اپنے رفقاء اور طلبہ کی کردار سازی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ دور کرنے کیلئے بعض رسائل بھی جاری کیے جن میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" شامل ہیں۔

جب سرسید احمد خاں نے ۱۸۳۹ میں اپنی تصنیف و تالیف کا آغاز کیا تو ان کے موضوعات میں تاریخ و سوانح اور مذہب نمایاں تھے۔ ۱۸۵۷ سرسید احمد خاں کی زندگی میں انقلابی سال کے طور آیا۔ ۱۸۵۷ کے بعد سرسید احمد کا مقصد مسلمانوں کی حمایت تھا۔ ۱۸۵۷ کی جدوجہد آزادی کے دوران انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرایا گیا۔ سرسید نے ٹھان لی ہے کہ مسلمانوں پر لگے الزامات کا دفاع کرنا ہے اور انگریزوں کے ذہنوں میں ہندوں کی پھیلائی ہوئی بدگمانیوں کو دور کرنا ہے۔ اُن کو یہ بھی یقین تھا کہ انگریزوں نے ۱۸۵۷ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

مرادآباد میں قیام کے دوران سرسید احمد خاں نے آگرہ سے ایک رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کے نام سے نکالا۔ اس میں مسلمانوں پر لگائے گئے الزامات کی تردید کی۔ (۱۳)

چونکہ سرسید احمد خاں انگریز حکومت کے ملازم تھے اس کے باوجود انھوں نے جرات مندانہ طریقے سے مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کی۔ یہ رسالہ "اسباب بغاوت ہند" Muffsellite Press پریس سے شائع ہوتا تھا۔

رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت کے بعد حکومت برطانیہ کے بعض اعلیٰ عہداروں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ بحیثیت مجموعی اس رسالے کی اشاعت مسلمانوں کے حق میں بے حد سود مند ثابت ہوئی اور کچھ عرصے بعد حکمرانوں کے رویوں میں کافی بہتری بھی آگئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد سر ولیم ہنٹر کی مشہور زمانہ کتاب "Our Indian Muslims are they bound in conscience to rebel against the Queen" یہ بھی مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرانے کے طرز عمل کے خلاف ایک رد عمل تھا۔[۱۴]

رسالہ "اسباب بغاوت ہند" سرسید کی زندگی میں ایک بار ہی چھپا تھا۔ سرسید احمد خاں کے نظریات سے بعض مسلمانوں کے ایک طبقے کو اختلاف رہا ہے جبکہ سرسید احمد خاں نے ہمیشہ مسلمانوں کی بھلائی کیلئے کام کیا ہے۔

علی محمد خاں کا مضمون "حیات جاوید کی حمایت میں" "حیات جاوید" مولانا حالی کی تصنیف ہے جو انھوں نے سرسید احمد خاں پر لکھی ان کے مطابق الطاف حسین حالی کی سوانح عمریاں جدید عہد میں ایک نئی روایت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

"حیات جاوید" ۱۹۰۱ میں تصنیف ہوئی۔ یہ مولانا الطاف حسین حالی کا بڑا کارنامہ ہے انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود سرسید احمد خاں کی بہترین سوانح حیات لکھی۔ "حیات جاوید " میں ہے کہ سرسید احمد خاں اپنے مخالفین سے اس قدر تنگ آگئے تھے کہ انہوں نے ملک سے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مخالفین نے سرسید احمد خاں پر تہمت لگائی کہ یہ شخص قرآن وسنت کی تعلیمات کو پھیلانے کے بجائے انگریزی اور سائنسی تعلیم کی حمایت کرتا ہے۔

سرسید احمد خاں کی سوانح لکھنے کا خیال اُن کے ایک دوست کرنل گریہم کو آیا۔ جنھوں نے ان کی زندگی میں سرسید کی بائیو گرافی لکھ کر شائع کر دی تھی۔[۱۵] اس بات کا ذکر بھی "حیات جاوید" میں ہے کہ ایک غیر قوم کا فرد کرنل گریہم اس ضروری کام میں سبقت لے جاتا ہے۔ یوں تو سرسید احمد خاں کے بارے میں لکھنا آسان تھا لیکن چوں کہ مخالفوں نے ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ اوراق کا جواب دینا لازمی تھا اس لیے سرسید کی سوانح عمری میں اوصاف کے ساتھ کمزوریوں کو واضح کرنا ایک مشکل کام تھا۔

سرسید احمد خاں کی وفات کو سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود آج اُن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ "حیات جاوید" الطاف حسین حالی کا ایک قابل تحسین عظیم کارنامہ ہے۔ یہ دوسرے سوانح نگاروں کیلئے قابل تقلید ہے۔

افضل حق کا مضمون "نوادر سید" میں سرسید کے بارے میں چند نئی دستاویزات پیش کی گئی ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱. نواب کلب علی خاں فائق کی طرف سے مدرسۃ العلوم کیلئے مشروط امداد کی سند جو سرسید احمد خاں کو دی گئی۔ مولوی عبدالرحمٰن شاکر ایڈیٹر نورالانوار کانپور اور سرسید کے دو خط جو سرسید کی جانب سے اخبار میں چھپے ہوئے اشتہار کے سلسلے میں ہیں۔ اس کے ساتھ سرسید کا اشتہار والا خط بھی درج کر دیا گیا ہے۔

۲. "سفیر ہندوستان" امرتسر کی اشاعت ۲۶ مئی ۱۸۷۷ میں سرسید کا ایک اشتہار شائع ہوا جس میں انھوں نے طالب علموں کی یورپ میں تعلیم کیلئے امداد کی اپیل کی تھی۔ سرسید نے اس حوالے سے "سفیر ہندوستان" کے مدیر کو وضاحتی خط بھی لکھا جو "سفیر ہندوستان" میں چھپا۔ یہ دونوں دستاویزات "تہذیب الاخلاق" سے نقل کی گئی ہیں۔

۳. سرسید کو لکھے جانے والا ایک خط مولوی نیاز علی کا ہے جنھیں سرسید احمد خاں نے خط لکھ کر اپنی تفسیر قرآن کی قیمت اور فروخت سے متعلق کچھ معاملات کی وضاحت کی ہے یہ خط ڈاکٹر سلطان محمود حسین کی تالیف "تاریخ پسرور" سے لیا گیا ہے۔

۴. روئداد اجلاس چہارم "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" میں سرسید کی ایک رپورٹ شامل ہے جس میں ان کا یہ خط متعلق روئداد سے یہاں لیا گیا ہے۔

۵. سرسید احمد کا خط بنام مدیر "چودھویں صدی" جس میں انھوں نے سرکاری ملازمت میں غیر اسلامی قانون کے بارے میں احکامات پر بات کی ہے۔

۶. سرسید احمد خاں کا خط "محمڈن اینگلو اورینٹل" کانفرنس کے اراکین کے نام ہے جس میں کمیٹی کے متعلق کچھ تجاویز دی گئی ہیں۔

۷. سرسید کی اسی ویں سالگرہ کی مبارکباد کے سلسلے میں جوابی خط

۸. میر شاکر علی کی خطاطی دیکھنے کے بعد سرسید احمد کا تاثراتی خط

۹. سرسید کا امیر مینائی کی امیر اللغات کی تین جلدیں شائع ہونے پر ایک تعریفی خط

۱۰. سرسید احمد خاں کا مولوی عنایت دہلوی کے نام جس میں ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کے ترجمے "دعوت اسلام" کے کچھ مباحث اصلاح کی تجویز کی گئی ہے۔

اب تک چند مضامین کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو مجھے زیادہ پسند آئے اب کچھ ایسے مضامین کا نسبتاً مختصر جائزہ لیا جارہا ہے جو اپنے موضوع پر اہمیت کے حامل ہیں۔ سرسید شناس اصغر عباس نے اپنے مقالے "سرسید کے پنجاب کے پانچ سفر" میں سرسید کے اسفار پنجاب کی تفصیل دی ہے۔ سرسید احمد خاں نے ۱۸۹۴، ۱۸۸۸، ۱۸۷۴، ۱۸۷۳، ۱۸۹۵ میں پنجاب کے پانچ سفر کیے۔ ان اسفار کے دوران وہ پنجاب کے شہروں لاہور، امرتسر، جالندھر اور گورداس

پور گئے۔ مقالہ نگاروں نے ان اسفار کی روداد "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں شائع ہونے والی روئدادوں سے یہاں درج کی ہے۔ اپنے موضوع پر یہ مقالہ بہت اہمیت کا حاصل ہے۔

نامور محقق رفاقت علی شاہد کا مقالے "آثارالصنادید" کی اشاعتی تاریخ معہ تجزیاتی مطالعہ میں سرسید کی معروف تصنیف کی اشاعتوں کی تفصیل اور تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ سرسید کی یہ کتاب دہلی کی تاریخ اور تاریخی عمارتوں کی تفصیل کے بارے میں ہے۔ مقالہ نگار نے آثارالصنادید کی جن اشاعتوں کی تفصیل اور ان پر تحقیقی مطالعہ تحریر کیا ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

اشاعت اول ۱۸۴۷

اشاعت دوم ۱۸۵۴

اشاعت سوم ۱۸۷۶

اشاعت چہارم ۱۹۰۴

اشاعت پنجم ۱۹۵۹

اشاعت ششم ۱۹۶۵

اشاعت ہفتم ۱۹۶۶

اشاعت ہشتم ۱۹۹۰

اشاعت نہم ۱۹۵۱ (جزوی اشاعت)

اشاعت دہم ۲۰۱۷ (جزوی اشاعت)

شمس بدایونی نے اپنا مقالہ "کتاب فقرات یعنی صدپند فارسی" پر تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ سرسید احمد خاں کی کتاب فقرات، کے بارے میں ہے جس میں حکیم لقمان کی مشہور کتاب صدپند کو اردو زبان میں ڈھالا ہے۔ یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ تحقیقی جائزے اور دوسرا کتاب کے متن اور موضوع (پند و موعظمت) پر ہے۔ اس کی دو اشاعتیں ہوئیں۔

حمیرا ارشاد کا مقالہ سرسید کے سفر نامے "مسافران لندن" کی لاہور اور علی گڑھ کی اشاعتوں کے تقابل پر ہے۔ اس میں انھوں نے پہلے تو سرسید کے سفر لندن کا مقصد بیان کیا ہے۔ سرسید کے لندن کے سفر کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان پیدا ہونے والی نفرت ختم کرنے، طالب علموں کے یورپ جانے کے اخراجات کا انتظام کرنے اور مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کی کوشش کرنا۔ یہ روداد پہلے "سائنٹیفیک

سوسائٹی گزٹ" علی گڑھ میں شائع ہوئی۔ "مسافران لندن" پہلی بار مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۱ میں شائع ہوئی۔ جسے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی اشاعت علی گڑھ سے ۲۰۰۹ میں ہوئی۔ اسے معروف سرسید شناس ڈاکٹر اصغر عباس نے مرتب کیا تھا۔ (۱۶)

حمیرا ارشاد نے دونوں تجزیاتی اور تحقیقاتی مطالعہ کر کے خوبی اور خامیاں واضح کی ہیں۔ یہ مقالہ اپنے موضوع پر اہم مباحث کا حامل ہے۔ سید عبداللہ کا مضمون "سرسید کا اثر ادبیات اردو پر" میں سرسید کی تصانیف میں حقیقت پسندی، تحقیق، سائنسی نقطہ نظر کے اثرات واضح کیے گئے ہیں۔ سید عبداللہ کے مطابق سرسید کا انداز دوسرے ادیبوں سے مختلف رہا ہے۔ دینی و مذہبی ادب پر ان کی دو کتابیں "تبین القلام" اور تفسیر القرآن" ہے۔ ان دونوں تصانیف سے دینی ادب کے اسلوب پر گہرا اثر مرتب ہوا ہے۔ حال ہی میں وفات پانے والے ابوالکلام قاسمی کا مقالہ "سرسید کا اسلوب نثر" پر ہے اس مقالے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کا طرز تحریر دیگر ادیبوں سے مختلف رہا ہے ان کا انداز تحریر اور زبان و بیان اپنی بعض خوبیوں کی بنا پر موثر رہا ہے۔ سرسید کے طرز تحریر میں استدلالی اور تجزیاتی طریق کار پایا جاتا ہے۔ یہ مقالہ سرسید کے موثر اسلوب نثر کی خصوصیات واضح کرنے کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر اصغر عباس کا مقالہ "سرسید اور محمد حسین آزاد" پر ہے۔ مقالہ نگار نے سرسید اور محمد حسین آزاد کے روابط اور سرسید اور محمد حسین کی ذہنی مطابقت کے بارے میں لکھا ہے۔۔ محمد حسین آزاد سرسید احمد خاں کی تحریک کے ایک روشن چراغ کی حیثیت سے اہمیت کے حامل تھے۔ اصغر عباس کے اس مقالے سے سرسید احمد خاں اور محمد حسین آزاد کے تعلقات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا مقالہ "سرسید۔ اکبر اور سیر سید" دونوں شخصیات کے مابین تعلقات پر مبنی ہے۔ اس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ سر سید احمد خاں کے کارناموں، مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوششوں، مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرنے اور مسلمانوں کو ایک طاقت ور قوم کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ کام اتنا آسان نہ تھا اس راستے میں سرسید کو جن مخالفین کا سامنا کرنا پڑا اُن میں اکبر الہ آبادی بھی تھے۔ اکبر الہ آبادی کی فکر اور سوچ کا انداز عام مسلم دانشوروں کی طرح تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے طنز و مزاح کے نشتر سرسید پر چلانا شروع کر دیے۔ یہ مقالہ سرسید پر اکبر الہ آبادی کی طنزیہ شاعری اور نثر کی اہمیت واضح کرتا ہے۔

زاہد منیر عامر نے "سرسید شناسی کا دورِ اول اور ظفر علی خاں" کے موضوع پر اپنا مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ دراصل سرسید اور ظفر علی خاں کے ایک مضبوط تعلق کے بارے میں ہے۔ ظفر علی خاں نے علی گڑھ کالج میں داخلے کے بعد علی گڑھ کے جلسوں میں نظمیں پڑھنا شروع کیں تو سرسید ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوئے۔ ظفر علی خاں

بھی سرسید کی شخصیت سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ سرسید کو نائٹ ہڈ کا خطاب ملنے کے موقع پر مسٹر کینڈی نے جو خطاب کیا، ظفر علی خاں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ "حیات جاوید" میں شامل ہے۔ (۱۷)

یہ مقالہ سرسید اور ظفر علی خاں کے روابط کی بعض اہم جہتوں کو سامنے لاتا ہے۔ مقالے کی طوالت کو مد نظر رکھتے ہوئے مقالات پر جائزے کا سلسلہ یہاں ختم کیا جاتا ہے۔ چوں کہ سرسید پر اس اہم ترین خاص شمارے میں سبھی مضامین قابل مطالعہ اور قابل استفادہ ہیں۔ اس لیے آخر میں بقیہ مضامین کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔ اس سے قارئین کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس خاص شمارے میں محققین اور نقادوں کی کیسی کیسی اہم تحریریں شامل ہیں۔

بقیہ مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱. حیات سرسید ماہ و سال کے آئینے میں ا	فضل حق قرشی
۲. ذکر ایک نائب منشی کا	اقتدار عالم خاں
۳. سید احمد خاں اور مغل عہد	ڈیوڈ لیلی / محمد شمیم الزماں
۴. سرسید کا تاریخی شعور	اقتدار حسین صدیقی / جمشید احمد ندوی
۵. سید احمد خاں اور تاریخ نویسی	عرفان حبیب
۶. آثار الصنادید: آثاریات پر ایک نادر دستاویز	ضیاالرحمٰن صدیقی
۷. سرسید احمد خاں اور فارسی زبان	انجم حمید
۸. سرسید کا علم کلام	حبیب اللہ غضنفر
۹. سرسید کا مذہبی شعور	شوکت سبزواری
۱۰. سرسید کی اسلامی بصیرت کا تنقیدی جائزہ	جمال خواجہ
۱۱. سرسید کا نظریہ عقل و فطرت	اسلوب احمد انصاری
۱۲. سرسید کی سیرت نگاری، خطبات احمدیہ کے حوالے سے	محمد یٰسین مظہر صدیقی
۱۳. سرسید پر ولی اللہی تحریک اور وہابی تحریک کے اثرات	اقتدار حسین صدیقی
۱۴. عصر حاضر میں سرسید کے تعلیمی مشن کی معنویت	محمد مسعود عالم قاسمی
۱۵. سرسید کا سیاسی شعور	نورالحسن نقوی
۱۶. سرسید کا سیاسی نقطہ نظر	شان محمد
۱۷. مسلمانوں کی موجودہ صورتحال میں سرسید کی معنویت	محمد یٰسین

۱۸. اردو کا شعری وادبی سرمایہ اور سرسید کا اصلاحی وافادی نقطہ نظر	قمر الہدیٰ فریدی
۱۹. سرسید احمد خاں، حاضرین ومتاخرین کی نظر میں	سی ڈبلیو ٹرول / قاضی افضال حسین
۲۰. سرسید احمد خاں اور مولانا محمد قاسم نانوتوی	ظفر احمد صدیقی
۲۱. سرسید کے ایک معاصر عالم، حافظ محمد لکھوی	امجد علی شاکر
۲۲. تحریک سرسید کی ایک اہم شخصیت، شمس العلما سید ممتاز علی	نازنین اختر
۲۳. تنقید سرسید، اکیسویں صدی میں	امجد طفیل
۲۴. سرسید کا مخالف اخبار "میمور یل گزٹ"	محمد عتیق صدیقی
۲۵. سرسید احمد خاں	عنایت اللہ
۲۶. آنرایبل سرسید احمد خاں بہادر غفرلہ	عبد الرزاق کانپوری
۲۷. سرسید کی زندگی کے چند روحانی گوشے	راشد عزیز وارثی

حوالہ جات

۱۔ قرشی افضل حق، حیات سرسید ماہ وسال کے آئینے میں سہ ماہی "صحیفہ "لاہور شمارہ ۲۳۰۰-۱۲۳۴ جولائی ۲۰۱۷۔ ستمبر ۲۰۱۸، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۹

۲. ایضاً ص ۱۲

۳۔ قاسمی محمد مسعود عالم، عصر حاضر میں سرسید احمد خاں کے تعلیمی مشن کی معنویت ، ص ۲۹۴

۴۔ قرشی افضل حق، حیات سرسید ماہ وسال کے آئینے میں ص ۹

۵۔ فراقی تحسین، سرسید، چند معروضات اور ان کے دو غیر مطلوبہ مکتوب، ایضاً ص ۲۳

۶. ایضاً ص ۲۴

۷۔ ناشاد، ارشد محمود "مسدس حالی" سرسید احمد خاں اور فیروز الدین فائض، ایضاً ص ۵۷

۸۔ ایضاً ص ۵۸

۹۔ ایضاً ص ۵۹

۱۰۔ ایضاً ص ۶۱

۱۱۔ نعمانی، شبلی، "سید سر مرحوم اور اردو لٹریچر" ایضاً ص ۳۵۸

۱۲۔ سرور احمد، آل، سر سید کے ایک مخالف، مولوی علی بخش خاں شرر، ایضاً ص ۴۴۴

۱۳۔ عقیل، معین الدین، سر سید کا سب سے اہم کارنامہ، ایضاً ص ۳۴۰

۱۴۔ ایضاً ص ۳۴۰

۱۵۔ ایضاً ص ۳۴۱

۱۶۔ حمیرا ارشار، سر سید کے سفر نامے مسافران لندن کی لاہور اور علی گڑھ کی اشاعتوں کا تقابلی، ایضاً ص ۱۴۸

۱۷۔ عامر، زاہد منیر، "سر سید شناسی کا دور اول اور ظفر علی خاں" ایضاً ص ۵۲۳

References in Roman Script:

1. Qarshi, Afzal Haq, Hyaat e Sir Syed, Mah o Saal Kay Aeiny mein, She Mahi"Saheefa", , Shumara 1234-2300, July 2017 to September 2018, Majlis Taraqqi e Adab, Lahore, P.9
2. Ibid, P-220
3. Qasmi, M.Masood, Alam, Asr e Hazir mein Sir Syed ky Taleemi Mission ki Manviyat, P.294
4. Qarshi, Afzal haq, Hayat e Sir Syed Mah o Saal Kay Aeiny Mein, P.9
5. Firaqi, Tehseen, Sir Syed, Chand Maroozat awr unkay do Ghair Matbooa Maktoob, P.23
6. Ibid, P.220
7. Nashaad, Arshad Mahmood, Musadas e Haali, Sir Syed Ahmad Khan awr Ferooz Ud Din Faiz, P.57
8. Ibid, P.58
9. Ibid, P.59
10. Ibid, P.61
11. Nomaani, Shibli, Sir Syed Marhoom awr Urdu Literature,P.358
12. Saroor, Aal e Ahmad, Sir Syed kay aik Mukhalif, Moulvi Ali Bakhsh Sharar, P.444
13. Aqeel, Moeen Ud Din, Sir Syed ka Sab say Bara Karnaama, P.340
14. Ibid, P.41
15. Ibid,P.51
16. Humaira Arshad, Sir Syed ky Safar Namy" Musafiran e London" Ki Lahore awr Ali Garh ki Ishaton ka Taqabali Mutala, P.148
17. Amir, Zahid Munir, Sir Syed Shanasi ka Dour e Awal awr Zafar Ali Khan, P.523

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.275

ڈاکٹر محمد نعیم

ایسوسی ایٹ پروفیسر، ادارہ زبان و ادبیات اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

اردو ناول میں ثنوی فکر کا کلامیاتی تجزیہ

Dr. Muhammad Naeem
Associate Professor, Institute of Urdu Language and Literature, University of the Punjab, Lahore.

Discourse Analysis of Binary Thinking in Urdu Novel

ABSTRACT

Binary thinking is a way of understanding the world around. It is used to oversimplify the complex situations and reality. Dichotomous way of thinking usually uses an innate hierarchy of the tow objects or situations it makes binary of Urdu Novel since its inception used binary opposites to foreground the characters it likes or dislikes. In this article Critical Discourse Analysis (CDA) is used as a method to underscore the binary thinking in Urdu Novel. The article maps the social conditions of discourse and shows how these conditions were determining the discourse of Urdu Novel. Urdu Novel made many binaries of characters, social categories and race etc. Only two binaries, i.e. same gender and race are analyzed here.

Keywords: *Crtical Discourse analysis, Urdu Novel, Binary Thinking, Gender and Race..*

زبان کا عملی اور ابلاغی استعمال کلامیہ (Discourse) ہے اور اس بات کی جستجو کہ کسی کلامیے کو منطق اور ہم آہنگی کون سے عناصر فراہم کرتے ہیں کلامیاتی تجزیہ (Discourse Analysis) کہلاتی ہے۔ کلامیہ سماجی ساختوں سے متشکل ہوتا ہے اور سماجی تعلقات کو متشکل بھی کرتا ہے۔ یوں کلامیہ سماجی تشکیل بھی ہے اور سماجی تعلقات کا تشکیل کار بھی۔ اسی لیے کلامیہ سماجی استقلال اور تبدیلی ہر دو کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔ یہیں سے ناول میں موجود ثنوی فکر کے کلامیاتی تجزیے کا جواز ملتا ہے۔ کسی کلامیے کی خصوصیات متعین کرنے میں سماجی

Received: 05th Aug, 2022 | Accepted: 17th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

حالات کا کردار ہوتا ہے۔ یعنی سماجی حالات کی تبدیلی، کلامیے کے خصائص کو بدل دیتی ہے۔

سوسئیر کے لسانی ماڈل کی روشنی میں زبان تجریدی ساخت (Langue) اور حقیقی اظہارات (Parole) میں منقسم ہے۔[۱] لسانی اصولوں اور عناصر کے باہمی رشتوں پہ مبنی تجریدی نظام زبان کی عملی / حقیقی اظہارات کو ممکن بناتا ہے۔ کسی زبان کے بولنے والے اس کی تجریدی ساخت سیکھتے ہیں اور حقیقی اظہارات کے ذریعے روزمرہ تقریر / تحریر تخلیق کرتے ہیں۔ سوسئیر کا لانگ کا تصور غیر سیاسی ہے۔ اس تصور میں مضمر ہے کہ کسی زبان کے بولنے والے تمام افراد لانگ پہ یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ جبکہ کلامیاتی تجزیہ دکھاتا ہے کہ لانگ پہ سب کی قدرت یکساں نہیں ہوتی۔ اسی طرح لانگ رسومیات کا مجموعہ ہے، جو سوسئیر کے لسانی ماڈل کے مطابق وحدانی ہوتی ہیں۔ جبکہ کلامیاتی تجزیے کے مطابق رسومیات بھی متنوع ہوتی ہیں اور طاقت کے کھیل کے دوران میں صورت پذیر ہوتی ہیں۔[۲]

انسانوں کے باہمی تعامل سے جنم لینے والا سماج غیر جانبدار نہیں ہوتا۔ اپنے تاریخی سفر میں سماج نے افراد کے لیے ممکنات کے غیر مساوی میدان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ زبان کا ارتقا انسانی سماج کے پہلو بہ پہلو ہوا ہے اور کائنات کے بارے انسانی تصورات کی صورت گری بھی زبان کے اندر ہی ہوئی ہے۔ یوں کائنات بڑی حد تک زبان کے بیانات کے مجموعے کا نام قرار پاتا ہے۔[۳] کلامیے میں طاقت کی علامتی سطح پر انفرادی اختیار اور ادارہ جاتی صورتیں مستحکم ہوتی ہیں یا انھیں چنوتی دی جاتی ہے۔ طاقت غیر مساوی سماجوں میں ہمہ وقت موجود ہوتی ہے اور کئی صورتوں اور سمتوں میں اظہار کرتی ہے۔

زبان سماجی عمل (Process) ہے جسے سماجی ساختیں متعین کرتی ہیں[۴]۔ زبان کا سماج سے الگ، خود مکتفی وجود نہیں ہے۔ زبان میں قائم ہونے والا کلامیہ سماجی ساختوں سے تشکیل پاتا ہے، اسی لیے زبان کا محض لسانی اور قواعدی بنیادوں پہ کیا گیا تجزیہ ادھورا اور علمی یا کم از کم سماجی علمی اور سیاسی اعتبار سے ادھورا عمل ہے۔ زبان پہ سماج کے دیگر غیر لسانی ادارے اثر انداز ہوتے ہیں۔ زبان غیر سیاسی اور غیر سماجی مظہر نہیں ہے۔ اس کے استعمال کے ضوابط سماجی نظام سے وضع ہوتے ہیں۔ ادب کا بنیادی میڈیم زبان ہے، اس لیے ادب بھی سماجی پیداوار ہے۔ ادبی ادارے سماجی تشکیل ہیں۔

زبان بہ یک وقت ایک نظام بھی ہے اور نظام کی تشکیل کار بھی۔ یہ انسانی رشتوں کا مظہر بھی ہے اور ان کی متعینہ کار بھی۔ فرد کی تفہیمِ کائنات میں ابلاغ کا زیادہ تر انحصار زبان پر ہی ہوتا ہے، یوں زبان اس کے لیے خارج میں موجود دنیا کی تفہیم کا ذریعہ بھی ہے اور اس میں اپنے لیے امکانات کو بروئے کار لانے کا میدان بھی۔

کسی چھوٹے انسانی گروہ کی زبان ہو (جس کی مختصر ترین صورت دو افراد کے درمیان مکالمہ ہے) یا قومی یا

بین الاقوامی سطح پہ زبان کے تفاعل کا معاملہ ہو، زبان بیک وقت طاقت کے رشتوں کا اظہار اور ان کی تشکیل کار ہے۔ افراد کے باہمی تعامل کے دوران زبان کا یہ دوہرا تفاعل بروئے کار آتا ہے۔ نارمن فیئر کلو کے نزدیک کلامیاتی تجزیے کا مقصد اس دہرے تفاعل کا انتقاد ہے۔ مزید برآں یہ تجزیہ وضاحت کرتا ہے کہ سماجی حقیقت کے اندر کلامیے کی تعمیر کیسے ہوتی ہے، جس کا مقصد اس عمل کی دریافت کرنا ہے جو اس حقیقت کو بعض خاص حوالوں سے تبدیل کر سکے۔ (۵)

تنقیدی کلامیاتی تجزیے کی تین سطحیں ہوتی ہیں :

وضاحت: متن کا تجزیہ (Text Analysis)

تعبیر: تجزیہ عملیدگی (Processing Analysis)

توضیح: سماجی تجزیہ (Social Analysis)

تجزیاتی ماڈل میں سہولت کی خاطر ان تین سطحوں کو الگ الگ درج کیا گیا ہے، دراصل یہ تینوں سطحیں ایک دوسرے سے باہم پیوست اور منحصر ہیں۔

کلامیہ، زبان کا ایک مخصوص تصور ہے۔ اس تصور کی رو سے کلامیہ سماجی عملیدگی اور سماجی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ کلامیہ طاقت کا ایک کھیل ہے۔ سماجی رشتوں میں موجود طاقت کلامیے کے ذریعے لسانی صورت اختیار کرتی ہے۔ کلامیے کے اندر طاقت موجود ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ کلامیے کے عقب میں بھی طاقت کارفرما ہوتی ہے۔ تنقیدی کلامیاتی تجزیہ (Critical Discourse Analysis) کلامیے کے اندر اور عقب میں کام کر رہی طاقت کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ اس بات کی وضاحت اور تجزیہ پیش کرتا ہے کہ طاقت ور لوگ کس طرح کلامیے کی تشکیل کرتے ہیں، عمومی سماجی نظام کے ساتھ ساتھ طاقت ور کس طرح مخصوص سماجی مخاطبوں (Interview) کو کنٹرول کرتے ہیں۔ فیئر کلو کے تنقیدی کلامیاتی تجزیے میں کلامیہ سماجی جدوجہد کا ایک مظہر بھی ہے اور میدان بھی۔ فیئر کلو نے کلامیے اور متن میں امتیاز قائم کیا ہے، متن کو وہ ایک شے (Product) جبکہ کلامیے کو عملیدگی (Process) قرار دیتا ہے۔ کلامیاتی تجزیہ اسی عملیدگی کا جائزہ لیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ متون کا کلامیاتی تجزیہ پھر کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کی نظری بنیاد کیا ہے۔ اس کا جواب اس مفروضے میں موجود ہے کہ کلامیہ سماجی عملیدگی ہے اور متن اس کا ایک ذیلی حصہ ہے۔ ادب ایک علامتی دنیا ہے، جس میں مصنفین اپنی تحریروں کے ذریعے کلامیے میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ خود متون کی تشکیل میں کلامیاتی عملیدگی شامل ہوتی ہے، ان کے مشتملات کو متعین کرنے اور ان مشمولات کے بارے اٹھنے والے مباحث کی حدود متعین کرنے میں بھی سماجی کلامیے کا بنیادی حصہ ہے۔ اس لیے تنقیدی کلامیاتی تجزیے کے منہاج کو متون کے جائزے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ادبی کلامیے کا ایک جزو ناول ہے۔ انیسویں

صدی کی نثری روایت میں ناول غالباً سب سے حاوی اور پسندیدہ ادبی صنف تھی، جسے سماجی اصلاح، صنفی امتیازات، ثقافتی بیانیوں، استعماری صورتِ حال اور ادبی حظ کی مقبول مثالوں کے لیے استعمال کیا گیا۔

کلامیے کی ایک صورت مکالمہ بھی ہے۔ مکالمے میں شامل دونوں (یا زیادہ) افراد کی گفتگو اور اس کے معنی کا تعین ان کے باہمی (مضمر یا ظاہری) تعلق کی سطح سے ہوتا ہے۔ مکالمے میں شامل دونوں افراد سماجی لحاظ سے عموماً یکساں نہیں ہوتے اور اگر ہوں بھی تو ان کی مکالمے میں پوزیشن کا مساوی ہونا، کمیاب ہے۔ مکالمے کی فضا، الفاظ کا انتخاب، لہجے کی نرمی یا سختی، مکالمے کی سمت کا تعین اور موضوعاتی دائرے کی حد بندی بڑی حد تک اس غیر مساوی پوزیشن سے طے ہوتی ہے، جو مکالمے میں شامل دونوں متکلمین کو حاصل ہوتی ہے۔ زبانی / براہِ راست مکالمے میں کم از کم یہ سہولت موجود ہوتی ہے کہ دونوں متکلمین اپنے انفرادی اختیار اور سماجی پوزیشن کے لحاظ مکالمے میں حصہ لیتے ہیں، مگر تحریر میں یہ سہولت بہت کم، بلکہ بڑی حد تک حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً فکشن میں مصنف ہی کرداروں کے مکالمے لکھتا ہے۔ اگرچہ یہ بات فکشن کے بہت بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ مکالمہ کردار کی مناسبت سے لکھا جاتا ہے، اس کے باوصف مصنف کی ذاتی ترجیح اور اس کے نقطہ نظر کی پرچھائیں مکالمے کی بنت پہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے کسی ناول کا کلامیاتی تجزیہ کرتے ہوئے یہ ضرور دیکھا جائے گا کہ یہاں مکالمے میں شامل (کم از کم دو) ذہنوں کی جگہ ایک ہی ذہن دونوں طرف کی گفتگو تحریر کر رہا ہے۔ حقیقت پسند ناول اپنے ارد گرد پھیلی زندگی کی (بزعم خود، شعوری طور پہ،) نمائندگی یا اس سے اپنے عدم اطمینان کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے عالم میں ناول نگار مقدور بھر فکشنی رسومیات کی پابندی کرتے ہوئے کرداروں کو اپنی بات کہنے کا موقع دیتا ہے۔ ہماری نظر میں ناول نگار کی کامیابی بڑی حد تک کرداروں پر اس کی شعوری گرفت کے بالعکس متناسب ہے۔ مصنف جس قدر کرداروں کو آزادی دیتا ہے، اتنا ہی فنی طور پہ پختگی حاصل کرتا چلا جاتا ہے، کیوں کہ ناول بہر حال اس کی ذاتی زندگی کا عکس نہیں ہوتا، بلکہ متعدد زندگیوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے مکالمے کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار بھی اسی امر پہ ہے کہ کردار اپنی زبان بولتا ہے یا مصنف کی بولی دہراتا ہے۔ لیکن اس اپنی بولی کی تشکیل میں کلامیاتی عملیدگی بہر حال شامل ہوتی ہے۔

مکالمہ طاقت کی عملی صورت کا مظاہرہ کرنے، اسے چنوتی دینے، اپنی شناخت وضع یا واضح کرنے، سماجی مقام کو منوانے، مستحکم کرنے یا بڑھانے، اپنی فوقی حیثیت کو منوانے اور اپنے ذاتی تصور (Self-Image) کو ٹھوس شکل عطا کرنے جیسے متنوع افعال سر انجام دیتا ہے۔ اردو ناول کے ابتدائی نمونوں میں بیانیے کی بجائے مکالمے کی فضا غالب ہے۔ اس غلبے نے بعض اوقات شارحینِ ادب کو چند تحریروں کے بارے مخمصے میں ڈال دیا کہ وہ ناول ہیں یا ڈراما۔[۲] ناول کے مکالموں کا سیاق و سباق ان کی تفہیم میں سہولت دیتا ہے۔ لیکن جہاں مکالمے کے بعد بھی مکالمہ آئے

اور محض کسی باب کے شروع یا آخر میں بیانیہ نثر، مکالماتی مباحث یا واقعات کے نتائج اور کہانی کے ممکنہ اگلے یا پچھلے پڑاؤ کی خبر دیتی ہو وہاں کلامیاتی تجزیے کے لیے خود مکالمہ، اس کے مندرجات، کرداروں کا لہجہ، لفظیات اور لسانی حربوں جیسی جزئیات پہ توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ مکالمے میں شامل کرداروں کے پاس اظہار کے وسائل کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے تجزیے سے خود مصنف کی ترجیحات کا علم بھی ہو سکے گا۔

ابتدائی اردو ناولوں میں مکالمے کی کثرت کی کئی ممکنہ وجوہ ہیں۔ اول اردو میں اشاعتی سرگرمیوں کے عروج (انیسویں صدی کا دوسرا نصف) کے زمانے میں قارئین کو متوجہ کرنا؛ دوم استعماری صورتِ حال میں متعدد نقطہ ہائے نظر کی موجودگی: استعمار کاروں کا بیانیہ، مقامی متعدد بیانیے؛ سوم ناول کی صنف کی مائع اور تشکیلی حالت، جس کے مطابق ناول رفتہ رفتہ ذہنوں اور صفحات پہ اپنی صنفی حد بندیاں قائم کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ناول نگار اپنے تصورات (سماج کے بارے نئے تصورات) کے ذریعے سماج کو سمجھنے، اس کی تعبیر کرنے اور اسے بدلنے (اصلاح، احیا،) کے لیے اپنی سی کوششوں میں مصروف تھا۔ ایسے عالم میں مکالمہ ان سب ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ بن رہا تھا۔ ابھی سماجی اردو نثر انسان کو اس کے ماحول کی پیداوار، یا نفسیاتی وجود سمجھنے سے دور تھی۔ اگرچہ اس زمانے کے ناول میں کردار کی پیش کش میں سماجی تفصیلات اور نفسیاتی حقائق بھی شاملِ بیانیہ ہیں، تاہم فرد کا تصور بڑی حد تک اس کے کلام سے ہی ہو رہا ہے۔ اسی لیے ناولوں پہ مکالمے کا غلبہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ناول نگار کرداروں سے مخاطب ہیں کہ "بولو، تا کہ پہچانے جاؤ۔"

کرداروں کے مکالموں کا کلامیاتی تجزیہ کرتے ہوئے، انھیں ناول نگار کی طرف سے فراہم کی جانے والی آزادی کے ساتھ ساتھ مکان (space) کو بھی ایک اہم متغیر کے طور پہ دیکھا جائے گا۔ کسی کردار کو مکالموں میں جس قدر حصہ دیا گیا ہے وہ کہانی میں اس کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ناول کی سماجی فضا میں اس کی پوزیشن اور سماجی عمل میں اس کی اثر انگیزی کا اظہار بھی ہے۔ کردار کے خیالات، جذبات، احساسات کو مکالموں کے علاوہ بیانیے کے ذریعے بھی سامنے لایا جاتا ہے۔ کردار کے بارے بیانیے میں مصنف کا نقطہ نظر اور کردار کی طرف اس کے طرزِ فکر و احساس کا ذائقہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ مصنف کے سماجی تصورات کی تفہیم اور مختلف انسانی گروہوں کے ساتھ اس کے رشتے کی نوعیت کلامیاتی تجزیے سے سمجھی جا سکتی ہے۔

اساطیر کسی ثقافت میں پائے جانے والے لاینحل تضادات کو کسی بامعنی مظہر میں لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ کلائیڈ لیوی سٹراس نے دکھایا ہے کہ اساطیر ایک ایسا میکانزم ہے جو سادہ اور معروف معانی کے ذریعے کسی ثقافت کے حل نہ ہونے والے تضادات سے معاملہ کرتا ہے اور سماجی فہم کی تائید کرتا اور اسے چنوتی بھی دیتا ہے۔ ان تضادات کو

عموماً متخالف جوڑوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ جب دو کردار کسی ثنوی ساخت میں متضاد بن کر سامنے آتے ہیں تو ان کے باہمی افتراق کی سادگی ان کے علامتی معانی کو عمومی اور قابلِ رسائی بنا دیتی ہے۔[۷]

انیسویں صدی کے برِ صغیر میں ناول کا کلامیہ جس سماجی عملیدگی کی پیداوار ہے، اس میں خواندگی، استعماری علمی وضعوں سے واقفیت، استعماری اداروں سے تعلق، بہتر سماجی مقام، وسائلِ طباعت تک رسائی اور قابلِ قبول قارئین جیسے مراحل شامل ہیں۔ بحیثیت صنف ناول کا ورود اور مقبولیت دونوں خواندہ سماجوں کی پیداوار ہیں۔ ناول میں ایجادِ بندہ کا پہلو غالب ہوتا ہے۔[۸] اردو داستان، بیانیہ پہ داستان گو کی قدرت کے ذریعے فن کاری کا نمونہ پیش کرتی ہے، لیکن اس میں پلاٹ کی خوبی یا ندرت بطورِ خاص کوئی توجہ دکھائی نہیں دیتی۔ داستان کی شعریات میں ایک پھول کے مضموں کو سو رنگ سے باندھنے کی اختراع تو ملتی ہے، لیکن فوری سماجی حالات سے کوئی پلاٹ اخذ کرنا یا اسے براہِ راست موضوع بنانا ناول کی ایجادات میں سے ہے۔ معاصر سماج سے دلچسپی کے اسباب بھی بدیسی حکومت اور دیسی آبادی کی شہری ہنر مندیوں کے لیے کی جانے والی انتظامی تبدیلیوں نے پیدا کیے تھے۔ مغرب میں ناول کا استحکام اشاعتی سرگرمیوں کے فروغ، عام تعلیم کے نتیجے میں قارئین کی بڑی تعداد اور قرات کے ذوق کا مرہونِ منت ہے۔ برعظیم میں بھی ناول کا ورود دیسی زبانوں میں اشاعتی اور تدریسی سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو ہوا ہے۔ ان سرگرمیوں میں استعماری حکومت کی سیاسی، انتظامی اور سماجی سرگرمیوں کا براہِ راست حصہ ہے۔

ابتدائی اردو ناول کے کلامیے میں مخالف ثنوی فکر (Binary Opposition) حاوی ہے۔ اس فکر نے اردو ناول میں کئی جوڑے تشکیل دیے ہیں، ان میں سے دو کو ہم اس جائزے میں پیش کریں گے۔

ہم صنفی ماڈل

اردو ناول میں متضاد ثنویت کی سب سے نمایاں مثال ہم صنفیت ہے۔ اس سے یہاں مراد ایسے جوڑے ہیں جن کا تعلق ایک ہی صنف (Gender) سے ہے۔ اس ثنویت کی نمایاں ترین مثالوں میں مراۃ العروس (۱۸۶۹)، مفید العورات (۱۸۷۴)، توبۃ النصوح (۱۸۷۴)، اصلاح النسا (۱۸۸۱)، چترِ بہنیلی (۱۸۸۴)، آرسی مصحف (۱۸۸۸)، فسانہ مبتلا (۱۸۸۵)، ارمان (۱۸۹۹)، مشیر نسواں (۱۹۰۶)، گودڑ کا لال (۱۹۰۷)، انوری بیگم (۱۹۰۹)، اختر النسا (۱۹۱۰)، روشنک بیگم (۱۹۲۰)، فغانِ اشرف (۱۹۲۱)، حسنِ معاشرت (۱۹۲۶) سرگزشتِ ہاجرہ (۱۹۲۸)، عاصمہ (۱۹۳۹) اور منجھلی دیدی (۱۹۴۱)، جیسے ناول شامل ہیں۔ ان سب ناولوں میں خواتین کے جوڑے پیش کیے گئے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مردوں کو ناول لکھنے پہ فوقیت حاصل ہے۔ سماجی نظام پہ بھی انھی کا غلبہ تھا اور وسائل پہ بھی انھیں کی دسترس تھی۔ اسی لیے ناول کے ابتدائی نمونوں میں خواتین کی اصلاح کے لیے مرتب ہونے والا بیانیہ مردانہ ہے، جسے

مردانہ اداروں سے تقویت مل رہی ہے۔ خواتین کا پھوہڑ پن اور سلیقہ دونوں سماجی زندگی میں ان کے بروئے کار آنے اور مفید ہونے پہ مبنی ہے۔ سماجی زندگی کی سمت اور بہتری کا تعین بھی مرد کر رہے ہیں۔ ثنوی ماڈل میں جہاں دونوں مظاہر ایک دوسرے کی معنوی تکمیل کرتے ہیں، وہیں ایک درجہ بندی بھی قائم کرتے ہی۔ ایسی درجہ بندی میں دونوں فریقوں کا مقام پہلے سے موجود کلامیاتی نظام کو تقویت دینے کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً مراۃ العروس کی ثنویت (اکبری / اصغری) میں ناول نگار واضح طور پہ ایک کردار (اصغری) کو دوسرے کردار (اکبری) پہ فوقیت دیتا ہے۔ پورا ناول اس درجہ بندی کے شواہد پیش کرنے میں صرف ہوا ہے۔ اس ناول پہ لکھنے والے اصغری کے حق اور مخالفت دونوں میں دلائل جمع کر چکے ہیں[۹] اصغری کی تعریف میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ گھر داری، تعلیم و تربیت اور سلیقہ شعاری میں بے مثال ہے اور سماجی فہم و فراست اور نئے معاشی ممکنات کی سمجھ بوجھ میں مردوں کے کان کاٹتی ہے۔[۱۰] یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس کو پسند کرنے والے تمام کے تمام ناول کے مردانہ کردار ہیں۔[۱۱]

نئی سماجی ضرورتوں نے جو کلامیہ تشکیل دیا، اردو ناول نے اپنے آغاز سے ہی اس میں ثنوی مخالف جوڑوں کے ذریعے تصورات کو سہل بنا کر پیش کرنے کا ڈھنگ اپنایا۔ اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس (۱۸۶۹) اس حوالے سے ایک ایسا پروٹوٹائپ ثابت ہوا جس نے اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے فکشن نگاروں کو بھی متاثر کیا۔[۱۲] اس ناول میں دو بہنوں کی مثال سے بہترین اور بدترین خاتون کی تجسیم کی گئی۔ اسی مثالیے کو بعد ازاں رشیدۃ النسا کے اصلاح النسا (۱۸۸۱) اور منشی جمیل کے آرسی مصحف (۱۸۸۸) میں بھی برتا گیا۔ منشی جمیل نے عین مین نذیر احمد کی طرح چھوٹی بہن کو عقیل اور بڑی کو کوڑھ مغز دکھایا ہے۔ منشی جمیل بڑی حد تک اپنے پیش رو اور معاصرین کے کلامیے کو لے کر چل رہے ہیں۔ اس کلامیے کی ڈور مردوں کے ہاتھ میں ہے اور خواتین کے لیے مجوزہ رول طے کر رہے ہیں۔ آیئے دونوں بہنوں کی صفات منشی جمیل کی زبانی پڑھتے ہیں:

> "چھوٹی بیگم بہ عنایت الٰہی نہایت سنجیدہ و فہمیدہ و عقیل و ذہین تھی... لیکن بڑی صاحب زادی عجب طرح کی کوڑھ مغز اور گھٹل تھیں"[۱۳]

چھوٹی کی فہمیدگی کو بڑی کا گھٹل پن قائم کر رہا ہے۔ دونوں کے مزاج کا یہ فرق ایک دوسرے کو سہارا دے رہا ہے اور دونوں کی صفات کو شدت سے نمایاں کر رہا۔ ذرا دیکھ لینا چاہیے کہ بڑی گھٹل کیوں ہے، اور اس کی کوڑھ مغزی کی کیا مثالیں پیش کی گئی ہیں جو اس کلامیے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ بڑی کھیل کود میں مگن رہنا چاہتی ہے، جبکہ چھوٹی ان سرگرمیوں میں جو اسے سمجھائی / سکھائی جا رہی ہیں۔ بڑی اپنی ذاتی تفریح کو ترجیح دیتی ہے، من موجی ہے، جبکہ چھوٹی نے مطلوب طرزِ عمل میں اپنی شخصیت کو مکمل ڈھال لیا ہے، بڑی کی سہیلیاں ذاتی ہیں۔ سہیلیوں کے

انتخاب میں بھی کوڑھ مغزی دکھائی گئی ہے۔ یہاں کلامیہ سماجی رشتوں اور درجہ بندی کو تقویت فراہم کرتا ہے۔ دلچسپ امر یہ کہ نذیر احمد کی اکبری ہو، رشیدۃ النسا کے ناول اصلاح النسا (1881) میں بسم اللہ کی ماں ہو یا اس ناول کی بڑی بہن، تینوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ ان کا میل جول اپنے طبقے کی خواتین یا ہم رتبہ لوگوں کی بجائے ملازماؤں یا ان کی اولادوں سے ہے۔ تینوں ناولوں کا زمانی فصل دو دہائیوں پہ پھیلا ہوا ہے اور مختلف شہروں اور مصنفین کے صنفی فرق کے باوجود سماجی درجہ بندی کا نظام تینوں میں یکساں ہے۔ تینوں کے ہاں شریف زادی کے بگاڑ کے اسباب میں فرق ہے، البتہ ایک سبب، ملازماؤں سے ربط ضبط تینوں کے ہاں مشترک ہے۔

انیسویں صدی کی ثنوی فکر سے بننے والا کلامیہ نئے خیالات کی ترویج کے لیے پرانے خیالات سے اس کا تقابل کرتا ہے۔ اس مدامی تقابل کا سبب موجود سماجی نظام میں معاشی پیداواری وسائل کا بدلتا ہوا اور باہم الجھتا منظر نامہ ہے۔ جاگیر داری سماج میں زمین کی ملکیت اور نسلی درجہ بندی کا کلامیہ حاوی تھا۔ فرد بطور شخص سماج میں عمل پذیر نہیں ہوتا تھا، اور اس کی شناخت بھی انفرادی یا ذاتی کی بجائے نسلی اور اجتماعی ہوتی تھی۔ شخصی اوصاف کا بھی زیادہ تر انحصار نسلی وابستگی پہ ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کا ناول کرداروں کی تعمیر میں اس کلامیے کو عموماً لے کر چلتا ہے۔ اس کلامیے میں ایک بنیادی تبدیلی معاشی ڈھانچے میں سرمائے کی آمد اور استعماری حکومتی سرپرستی سے ہوتی ہے۔ استعماری نظام کی ملازمتی ساختوں کے لیے مقررہ تعلیمی درجے اور مختلف ہنرمندیوں کی ضرورت نے عام تعلیم کو فروغ دیا۔ تعلیم کی طرف رغبت محض ملازمتی انعام سے پیدا نہیں ہوئی، سماجی نظام میں کلامیاتی تبدیلیوں نے بھی اس عمل کو مہمیز دی۔ ایسی ہی ایک تبدیلی نسل کے مقابلے میں علم کی آمد ہے۔ اس تبدیلیِ کلام (Discursive change) کو برپا کرنے میں سماجی مقتدر قوتوں کا بنیادی کردار ہے۔ علم سے دلچسپی اور مکتبی مواد کی عام فراہمی میں استعماری نظام کے کل پرزوں کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ تعلیماتِ عامہ کا ڈائرکٹر میتھیو کیمپسن ہو، یا اس کی ایما پہ لکھنے والے نظامِ تعلیم کے ملازمین ہوں، دونوں اس نئے کلامیے کی تعمیر میں حصہ لے رہے تھے۔ کلامیے کو کنٹرول کرنے کی یہ نمایاں مثال ہے۔ منشی محمد جمیل الدین نے میتھیو کیمپسن کے ارشاد پہ عورتوں کی تعلیم کے لیے آرسی مصحف تالیف کیا۔ یہ ناول متضاد ثنویت کو دو کرداروں کے ذریعے ابھارتا ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق علم اور جہل کا ہے۔ مراۃ العروس کی طرح یہاں بھی دو بہنوں کے قصے سے مقصود تبدیلیوں کے بارے پسندیدگی کو ابھارا گیا ہے۔ دونوں بہنیں نسلاً ایک ہیں، ان کی شخصیتوں میں امتیاز قائم کرنے والا عنصر علم ہے۔ یہاں یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ ذہانت کا تعلق بھی علم سے قائم کیا گیا ہے اور مزاج کی درستی کو بھی علم سے ہی جوڑا گیا ہے۔ دونوں بہنوں کی طبیعتوں کو دکھانے سے پہلے منشی جمیل نے علم کی فضیلت کی تمہید باندھی کہ "علم سے بہتر اور جہل سے بدتر دنیا میں کوئی شے نہیں۔ اس طرح کلامیے میں علم و

جہل کی تکبیر (Magnification) کی گئی ہے۔ وہ دنیا میں سب سے بہتر یا کہتر، یعنی اہم ترین مظہر بن کر سامنے آتے ہیں۔ علمی تکبیر کو مزید سہارا اس "تشکیلی حقیقت" سے دیا گیا ہے کہ "تمغہ شرافت" اسی سے ملتا ہے۔ یہ تبدیلی نسلی شرافت کو علم سے منسلک کرنا ہے۔ "شریف ڈال کا ٹوٹا سید" اگر "جہلِ مطلق" ہے تو سب (مقامیوں، ہم وطنوں) کی نظروں میں "حقیر" ہو گا، جبکہ پردیس میں سب اسے "رزیل" جانیں گے۔ اور "کیسی ہی چھوٹی امت" سے تعلق رکھنے والا ہو، "اگر خواندہ ہے" تو لوگ ظاہر میں آو بھگت کریں گے، تعظیم دیں گے۔"(۱۴)

یہاں سید کو جملے کے پیش منظر (foreground) میں لایا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ علم کے تمام تر اوصاف کے باوجود نسلی شرافت کا تصور سماجی طور پہ مرکز میں ہی ہے۔ جہاں پہلے نسل ہی سماجی شرف کے حصول کا ذریعہ تھی، اب اس میں علم کی تصدیق ملنا ضروری ہو گیا ہے۔ منشی جمیل علم کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، لیکن سماجی معیاراتِ شرف یکلخت تبدیل ہونے پہ آمادہ نہیں اور ان کا بھی مطمع نسل پہ تعلیم کو مطلق فوقیت دینا نہیں ہے، بلکہ وہ نسلی شرافت کے دوام کے لیے نئی معاشی نظام اور سماجی تبدیلیوں کی ضرورت کے پیشِ نظر علم کو لازمی قابلیت کے طور پہ پیش کر رہے ہیں۔ چھوٹی امت کو علم کی وجہ سے ملنے والی تعظیم بھی یہاں "ظاہر" تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی برتری کے قیام کے لیے شروع ہونے والا بیانیہ علمی وصف کے حامل نسلی کمزور فرد کو پس منظر (backgrounding) کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی کہی جا سکتی ہے کہ بیانیے کے مرکزی کرداروں کا تعلق شریف گھرانے سے ہی ہے۔

آرسی مصحف میں آگے چل کر 'علم' کے فضائل کی وضاحت آتو جی کی زبانی کی گئی ہے۔ یہاں وضاحت کے لیے اعتراض نما سوالات کا طریقہ کار استعمال کیا گیا ہے۔ جن کا آتو جی جواب دیتی ہیں۔ مکالمے کو دو طویل حصوں، سوال اور جواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سوالات میں سماج کو مرد و زن کے دو واضح منطقوں میں تقسیم کر کے پوچھا گیا ہے کہ مرد کا کام علم و فضل حاصل کرنا اور آمدن کا انتظام کرنا ہے جبکہ عورت کا کام گھر سنبھالنا ہے۔ یہاں منشی جمیل نے جاگیر داری سماج کے ان بنیادی نکات کو درج کر دیا ہے جن میں مرد و زن کے منطقے واضح اور مفترق ہیں۔ ان کے جواب میں آتو جی کی زبانی علم کے فوائد کو رکھا ہے: ان فوائد میں اولیت شرافت کو حاصل ہے۔ علم کو شرافت کا جوہر قرار دیا گیا ہے۔ دوسری بات خدا کی پہچان علم سے ہوتی ہے، اسے نا پہچاننے والا حیوان ہے۔ یہاں علم انسان اور حیوان میں امتیاز قائم کرنے کا معیار طے پا گیا ہے۔

نسلی ماڈل:

طبقاتی سماج میں تعلیمی نظام اور تعلیمی کلامیہ دونوں طبقاتی ایجنڈے کو تسلسل فراہم کرتے ہیں۔ تعلیمی

کلامیہ سماجی کنٹرول کے حامل طبقات کے مفادات کو دوام بخشنے والی آئیڈیالوجی اور اقدار کو اکثر غیر محسوس انداز میں فروغ دیتا ہے۔ [۱۵] ہمارا سروکار ناول سے ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ کیا انیسویں صدی کا شمالی ہندوستانی سماج طبقاتی تھا؟ اگر ناولانہ کلامیے کو دیکھا جائے تو ناول دولت کی تقسیم اور مالی وسائل پہ دسترس کی بنیاد پہ گروہی افتراق تو رکھتا تھا، تاہم تحریری کلامیے میں طبقاتی شعور سے زیادہ نسلی شعور کا پتہ ملتا ہے۔ اکثر لکھنے والے امارت یا غربت کی بجائے نسلی بنیادوں پر افراد کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ دوسری بات انیسویں صدی کے برصغیر میں حاوی پیداواری نظام بہر کیف سرمایہ دارانہ نہیں تھا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سرمایہ داری کی ابتدائی صورتیں اور سماج میں سرمائے کی بنیاد پہ نئے طبقوں کا ظہور انیسویں صدی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس دور میں ابھرنے والا سب سے اہم طبقہ تنخواہ داروں کا تھا۔ استعماری نظام کے سبب سرکاری ملازمین کی حیثیت محض ملازمین کی نہ تھی۔ انھیں عمومی سرمایہ دارانہ نظام کے ملازمت پیشہ افراد کی نسبت کچھ ایسے اختیارات بھی حاصل تھے، جن سے ان کا مقام منفرد حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ عمومی سرمایہ دارانہ نظام کے ملازمت پیشہ افراد کی طرح محض مالی لحاظ سے اپنے متعلقہ طبقے کا حصہ نہ تھے۔ ایک جابرانہ نظام کا حصہ ہونے کے سبب وہ عوامی طبقات سے ممیز تھے، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ استعماری انتظامیہ کے یورپی افسر طبقے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کی سماجی حیثیت یورپی اور عوامی طبقات سے الگ تھی۔ مسلم ملازمت پیشہ افراد کی حد تک امتیاز کا ایک سبب اور بھی تھا: غیر ہندوستانی نسب۔ مسلم ملازمت پیشہ مغل دور میں مصاحبین اور امرا کی صف میں شامل تھی جو خود کو ہندوستانیوں (مسلم اور غیر مسلم ہر دو سے) سے ممیز قرار دیتی تھی۔ اسی گروہ کو استعماری نظام میں سرکاری ملازمت نے امتیاز کی ایک اور بنیاد فراہم کر دی۔ نظام کا حصہ ہونے کے باعث انھیں کلامیے کی پیداوار اور نظامِ کلامیہ دونوں پہ عوامی طبقات کی نسبت اجارہ داری حاصل ہو گئی تھی۔ اس پہلو سے دیکھیں تو سرسید کے ایسے بیانات پہ قطعاً حیرت نہیں ہوتی جس میں وہ جنگِ آزادی کی تہمت محنت کش مسلم طبقات پہ دھرتے ہیں۔ [۱۶] ان کے ایسے بیانات ملازمت پیشہ مسلم گروہ کے مفادات کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ تھے۔ یوں اپنے تعلیمی اداروں میں داخلے کو اسی گروہ کے نوجوانوں تک محدود رکھنے کی سمجھ بھی آ جاتی ہے۔ اردو میں ناول لکھنے والے بیشتر افراد کا تعلق ملازمت پیشہ مسلم گروہ سے ہے، جو خود کو نسلی اعتبار سے ہندوستانیوں سے عموماً اور مقامی مسلمانوں سے خصوصاً ممتاز قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جب ناول لکھتے ہیں تو اپنی تحریروں سے سماجی درجہ بندی کے کلامیے کو مزید تقویت اور دوام بخشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابتدائی اردو ناول نگاروں کے ہاں یہ کاوشیں زیادہ شدت اور کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔ یہیں نسلی شنویت کا کلامیہ پروان چڑھتا ہے۔ جس کے مطابق اعلیٰ انسانی اور اخلاقی قدروں کا اجتماع اعلیٰ نسل کے لوگوں میں ملتا ہے اور کمتر نسل کے افراد اقدار سے محروم ہوتے ہیں۔ ناول میں کرداروں کی صفات کا تعین بھی ان کی

نسل کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ یا کرداروں کی اعلیٰ اقدار کی بنیاد ان کی نسلی برتری کو بنایا جاتا ہے۔ نسلی ماڈل ویسے تو ایک حد تک انیسویں صدی کے تقریباً ہر ناول میں مل جاتا ہے اور ثنوی اعتبار سے تقابلی فضا بھی عمومی طور پہ ناول کے کلامیے پہ چھائی ہوئی ہے۔ اردو ناول کے ابتدائی پچاس برسوں میں لکھے گئے ناولوں میں کرداروں کے خصائل کی بنیاد عام طور پہ ان کی نسلی وابستگی فراہم کرتی ہے۔ کرداروں کی اعلیٰ اخلاقی صفات بڑی حد تک ان کے خاندانی پس منظر سے ابھرتی ہیں جبکہ عمومی اخلاقی برائیاں بھی کم تر نسلی گروہ سے تعلق کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں۔[۱۷] اس پہلو کے لیے آرسی مصحف (۱۸۸۸)، ہیرے کی کنی (۱۸۹۹) اور آغا صادق کی شادی (۱۹۰۲) جیسے ناولوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

نسل کا حیاتیاتی (Biological) تصور فطرت پسندوں (Naturalists) کے ہاں جوہریت (essentialism) کو بنیاد بناتا تھا اور انسانوں کو مختلف نسلی گروہوں میں تقسیم کرتا تھا جس کی بنیاد خون، رنگ یا کھوپڑی کی شکل یا حجم ہوتے تھے۔ جوہریت پسند آنکھوں کی شکل، جلد کی رنگت یا بالوں کی اقسام جیسی خارجی طبعی صفات کے علاوہ نفسیاتی اور مزاجی رویوں کے لحاظ سے بھی کسی نسلی قوم کے افراد میں مماثلت فرض کرتے ہیں۔ نسل کے حیاتیاتی تصور کے حوالے سے عموماً دو نقطہ نظر (approaches) رائج رہے ہیں: نوعی (typological) اور جغرافیائی۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف سے اب تک ان دونوں کو مختلف دلائل اور شواہد کے ذریعے بڑی حد تک رد کیا جا چکا ہے، کیوں کہ ڈارون اور بعد کی تحقیقات دکھا چکی ہیں کہ کسی نوع کو یگانہ اور زمان و مکان کے اندر کسی بھی تغیر سے عاری اور دیگر انواع سے یکسر ممیز ثابت کرنا ممکن نہیں، اسی طرح ایک جغرافیے کے اندر بھی طبعی خواص اور جنیاتی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد اور یگانہ نسل کا سراغ نہیں ملتا، بلکہ بعض اوقات مذہبی، سماجی اور طبعی حالات کے سبب ایک ہی جغرافیے میں کئی نسلیں موجود ہوتی ہیں۔[۱۸]

اردو ناول کا عمومی بیانیہ جس کلامیے پہ بنا رکھتا ہے، وہ اپنی نہاد میں ٹھوس اور قطعیت کا حامل ہے۔ ناول میں کرداروں سے عام اور کسی حد تک لچکدار خصوصیات کی توقع تو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں جا کر کہیں ہوتی ہے۔ ابتدائی پچاس برس کے ناول میں کرداروں کی صورت اور سیرت انتہائی نوعیت رکھتی ہے۔ کوئی خوبصورت ہے تو انتہا کا، اور بدصورت ہے تو اسی میں یکتا۔ اس بیانیے کو ایک ہی کردار میں متعدد صفات کے اجتماع سے قائم کیا جاتا ہے۔ ان صفات کا انتخاب ثقافتی معیاراتِ جمال و اخلاق سے بامعنی ہوتا ہے اور صفات عموماً رسومیاتی (conventional) ہوتی ہیں۔ ان میں انفرادی اپج یا کردار کی مناسبت سے اختراع کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار اور قارئین میں ان سماجی معیارات کے حوالے سے اتفاق پایا جاتا ہے اور دونوں رسومیاتی بیانات کو بآسانی

قبول کرتے ہیں، جس کی سادہ دلیل ان صفات کی ایک سے زائد ناولوں میں موجودگی ہے۔ خاتون کے بیان میں صورت اور سیرت دونوں کا تقاضا مردانہ معیارات رکھتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کے ناول کرداروں کی صفات کے رسومیاتی استعمال کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کے ناولوں سے مرتب ہونے والا بیانیہ مردانہ ہے، جو خاتون سے بہترین صورت اور اعلیٰ ترین سیرت کا متقاضی ہوتا ہے۔ ان کے ایک نسبتاً کم معروف ناول آغا صادق کی شادی (۱۹۰۲) رسومیاتی بیانات کی مثال فراہم کرتا ہے۔ شرر ناول کو عشقیہ قصہ سمجھتے تھے۔ ان کے معاشرتی ناول سماجی مسائل کی بنیاد پہ لکھے گئے۔ ان ناولوں میں ان کا بظاہر نقطہ نظر جدت پسند ہے۔ مثلاً انھوں نے پردے کی مخالفت میں ایک ناول بدرالنسا کی مصیبت تحریر کیا۔ آغا صادق کی شادی میں انھوں نے بغیر دیکھے شادی کرنے کے نقصانات کی تصویر کھینچی ہے۔ ناول کے سرورق پہ لکھا ہے کہ اس اوریجنل ناول میں ناواقفیت سے اکثر شادیوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو دکھایا گیا ہے۔ آغا صادق ایک ایرانی تاجر ہے جو ہندوستان میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ ایک خوشامدی مصاحب کے ہاتھوں نکاح کے معاملے میں دھوکا کھا جاتا ہے۔ اسے ایک خوبصورت لڑکی دکھا کر ایک بدصورت لڑکی سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ ثنویت خوبصورتی اور بدصورتی کے بیان میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ آغا صادق خوبصورتی کا خواہشمند ہے۔ آغا پہ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کی حقیقت کھلنے کے مقام پہ ہی شرر نے بدصورتی کے لسانی وسائل کو مجتمع کر دیا ہے:

> "یا تو اس حور وش، نازنین وناز آفریں لڑکی اور چاند سی دلھن کو بیاہ لائے تھے۔ یا اب جو دیکھتے ہیں تو وہی دلھن کے کپڑے پہنے ہوئے ایک ایسی بدصورت اور بدقطع لڑکی پاس بیٹھی کہ دیکھ کے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کالی کلوٹی، موٹے موٹے ہونٹ، پھولی اور چیچک کے داغوں کی انتہا سے زیادہ کتھری ناک، بھنچے ہوئے گال اور اس پہ طرہ یہ کہ ایک آنکھ سے کانی اور دوسری آنکھ ہے بھی تو بالکل چپڑی۔ ہماہمی اور دھینگا مشتی میں اتفاقاً سر بھی کھل گیا تو معلوم ہوا کہ چندیا گنجی ہے۔"(۱۹)

لیجیے کوئی ایسا ناک نقشے کا عیب رہ تو نہیں گیا جو شرر نے بیان میں شامل نہ کیا ہو۔ بیانیے میں ثنویت کو "یا" کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔ خوبصورت لڑکی کی جو صفات شرر نے یہاں پیش کی ہیں، وہ ان کے دیگر معاشرتی اور تاریخی ناولوں میں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً ملک العزیز ورجنا (۱۸۸۸) جیسے پہلے تاریخی ناول کو دیکھ لیجیے یا ان کے معاشرتی ناول دلچسپ کا مطالعہ کیا جائے دونوں میں خوبصورت کو "نازنین" اور "ناز آفرین" کے ذریعے ہی بیان کیا گیا ہے۔ یہاں زیادہ دلچسپ بیان بدصورتی کا ہے۔ اس بیان میں چہرے کے عیوب کو باریک بینی اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ شرر

کی جدت پسندی صفات کے بیان میں روایتی ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے بد صورتی سے مرد کو خوف زدہ دکھایا ہے۔ یاد رہے جملے میں فعل کا استعمال اس طور سے کیا گیا ہے کہ کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آغا صادق خوف زدہ ہو گیا ہے۔ فعل حال مطلق کا استعمال اسے عمومی بنا دیتا ہے، جس سے راوی اور قاری دونوں آغا صادق کے مشاہدے میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد بد صورتی کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ ان میں موضوعاتی سطح (topicalization) کالی رنگت کو دی گئی ہے۔ یہ جمالیاتی معیار بیانیے کو شمالی ہندوستان کے سماجی کلامیے سے منسلک کر دیتا ہے۔ ایک ایسا سماج جو مختلف نسلوں پہ مبنی ہے اور جہاں رنگ کی بنیاد پہ نسلی افتراق قائم کیا جاتا ہے۔ یہیں شرر کی جدت، ان کے ثقافتی معیارات کی روایت پسندی سے گہنا جاتی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا انفرادی شعور بیانیے کے ذریعے سماجی رواجوں کو تبدیل کرنے کا خواہش مند ہے تاہم ان ثقافتی شعور جس نظام کلامیہ کا پروردہ ہے، وہ اسے روایت کے استحکام کے لیے استعمال کر لیتا ہے۔ یوں بیانیہ متضاد خصوصیات کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ شمالی ہند میں نقوش کا تیکھا پن بھی جمالیاتی معیار ہے اور ثریا بیگم اس سے محروم ہے، اس کے ہونٹ موٹے، ناک پھولی اور چیچک زدہ ہے جبکہ وہ ایک آنکھ سے کانی، گال پچکے اور چندیا سے گنجی ہے۔ چہرے کے کسی حصے سے سلامتی کی خبر نہیں آئی۔ شرر نے عمومی انداز کے عین مطابق متعدد خامیاں ایک ہی جگہ جمع کر دی ہیں، جس نے کردار سے نفور پیدا کرنے کا سامان فراہم کیا ہے۔

بیانیے کی پیچیدگی کو ایک اور حقیقت ہوا دیتی ہے۔ ثریا بیگم کا تعلق شریف گھرانے سے ہے۔ اردو ناول کا عمومی بیانیہ کسی شریف زادی کی صورت کے بیان سے محترز رہتا ہے، بلکہ اس ناول کے علاوہ شاید ہی کہیں کم صورتی کی بھی کوئی مثال ملے۔ ایسے عالم میں اس تضاد کا کیا حل ہے؟ کیا شرر اس عمومی کلامیاتی روش سے ہٹ کر ایک شریف زادی کو بد صورت دکھا رہے ہیں، تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ بد صورتی کی انتہا دکھانے کا تعلق نسلی شرافت سے نہیں ہے، اس تضاد کی وجہ رسومیاتی ہے۔ چونکہ بیانیہ عموماً اپنی نوع میں شدت رکھتا ہے، اس لیے بد صورتی کی متعدد نشانیاں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔ آغا صادق، ثریا بیگم کو چھوڑ دیتا ہے اور کلثوم کو اپناتا ہے، جس کا چہرہ دکھا کر اسے شادی پہ آمادہ کیا گیا تھا۔ آغا صادق کو ثریا سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کلثوم، ایک خاتون ہی اسے اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ ثریا کی "مٹی خراب ہو گئی" ہے، کیوں کہ اب وہ گئی گزری ہو گئی ہے۔ اس کے جواب میں آغا کا جملہ ثقافتی لحاظ سے بہت بھاری ہے جو مردانہ سماجی معیارات کی سفاکیت کا برملا اظہار ہے:

> "آغا صادق: مگر وہ تو پہلے بھی کسی اچھے گھر کے قابل نہ تھی۔ اس شکل و شمائل کی عورت کو بھلا کون شخص پسند کرے گا۔"(۲۰)

سماجی میل جول خصوصاً قانونی رشتوں کا قیام سماجی درجہ بندی کا اہم پیمانہ ہے۔ اس میں عام طور پہ نسلی برابری اور مرد کی بہتر سماجی درجہ بندی کا خیال رکھا جاتا تھا۔[۲۱] لیکن یہاں شادی کے لیے ایک اضافی معیار خوبصورتی کا بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بعد ازاں ثریا بیگم کی شادی اسی مصاحب سے کر دی جاتی ہے جس نے آغا کو دھوکا دیا تھا۔ شرر کا اس شادی پہ بیان ملاحظہ کیجیے: "ایک کالی کلوٹی، گنجی، بد قطع اور کانی جورو کی صورت ان [محمد حسین] کے حق میں ایک عذابِ الٰہی تھی۔"[۲۲]

اس بیان میں شرر نے ان صفات کا اعادہ کیا ہے جنھیں وہ آغا صادق پہ حقیقتِ حال کھلنے کے وقت بیان کر چکے ہیں۔ اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود شرر بھی سماجی معیاراتِ جمال کے اس حد تک قائل تھے کہ ایک بد صورت شریف زادی سے شادی کو عذابِ الٰہی سمجھتے تھے۔

برِ عظیم میں مسلم سماج نسل کا ایک تصور رکھتا ہے۔ اس تصور کی بنیاد پیدائش، پیشہ یا برادری ہو سکتی ہے۔ یہ تصور دیگر مسلم سماجوں سے مختلف ہے۔ اسلام میں "کفاءۃ" کے تصور کے باوصف برِ عظیم کے قدیم اور معاصر مسلم سماج میں نسلی درجہ بندی کی موجودگی نمایاں رہی ہے اور مسلم سماج کے مختلف گروہوں کے درمیان گہرے نامساوی تعلقات کے اصول عملاً موجود رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں پائی جانے والی اشراف، اجلاف اور ارزال کی تقسیم اسلام کے ابتدائی عہد میں نہ تھی (پہلی صدی ہجری کے بعد عرب و عجم کی تقسیم اور 'خادم الاسلام' اور 'جدید الاسلام' کی تقسیم ضرور موجود رہی۔) اس تقسیم کا آغاز تیرھویں صدی عیسوی میں دہلی سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کی مضبوطی کے ساتھ ہوا۔ اسی دوران انتظامی امور میں نو مسلموں کو ان کی سابقہ ذات کی بنیاد پہ ملازمت دی جاتی۔ اس دوران لکھے گئے بعض متون مسلمانوں میں رسول اکرم ﷺ سے نسلاً تعلق رکھنے یا نہ رکھنے کی بنیاد پہ درجہ بندی قائم کر رہے تھے۔ یہ تقسیم روزمرہ سماجی تعلقات کو ایک خاص نہج پہ کنٹرول کرنے، نسبت قائم کرنے اور اپنے متعلقہ گروہ کے مفادات کا تحفظ کرنے یا انھیں یقینی بنانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔[۲۳]

یہ اپنی جگہ اہم ہے کہ تیرھویں سے انیسویں صدی تک آتے آتے مسلمانوں میں نسلی درجہ بندی کا تصور اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ اس نے محاورات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ آغا شاعر کے ناول ہیرے کی کنی کے سرورق پہ ایسا ہی ایک محاورہ درج ہے: اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔ اس ناول کے مندرجات اور نتائج اسی محاورے کی تفسیر ہیں۔ اس ناول میں عام سماجی تعلقات میں عموماً اور شادی بیاہ کے معاملات میں خصوصاً "نسل" کا خیال رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

آغا شاعر نے معاصر ناول نگاری کے عمومی چلن کے مطابق ہر باب کا کوئی عنوان دیا ہے، جو اس میں مذکور واقعات کی طرف اشارہ کناں ہوتا ہے۔ پہلے باب "شوقین لڑکی" میں مصنف نے کم اصل لڑکی کی کمزوریاں دکھانے میں قریب دو صفحات سیاہ کیے ہیں۔ اُسے شادی کی جلدی ہے، آشنا سے ملتی ہے، سولہ برس کا سن، ماں باپ کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتی ہے اور شکایت کرنے والی ہمسائی کو بد دعائیں دیتی اور برا بھلا کہتی ہے۔ اگلے باب میں ناول کے مرکزی کردار نواب جہانگیر کو شہر کا یوسف قرار دیا گیا ہے۔ اُس زمانے کے عمومی بیانیے باپ کی وفات کے بعد نوجوان نواب یا رئیس زادوں کو مصاحبین کے ہاتھوں لٹنے کا تاسف بیان کرتے ہیں۔ اس ناول میں آغا شاعر نے لکھا کہ باپ کی رحلت کے بعد نواب زادے کو ملنے والے اختیارات نے مالی حالت کو کوئی 'گزند' نہ پہنچایا لیکن وہ "سیلف ریسپکٹ (حفظِ مراتب) "کا خیال نہ رکھ سکے، ایک مالن کی بیٹی پہ عاشق ہو گئے جس کا سن کر سارے شہر کی انگلیاں ان پر اٹھنے لگیں۔ آغا شاعر کا ناول اس سماجی درجہ بندی کو قائم رکھنا چاہتا ہے جو بیانیے سے باہر موجود ہے۔ وہ اس ناول کے ذریعے درجہ بندی کا خیال نہ رکھنے والوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ کیسے معاملات پیش آسکتے ہیں۔ اس بیانیے میں خاص بات انگریزی ترکیب Self Respect کا استعمال ہے۔ یہ اصطلاح جن معنوں میں آغا شاعر نے استعمال کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم ان کا بیانیہ اس اصطلاح کو انفرادی اور شخصی اکرام سے مختلف سمجھتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی بھی شخص کی عزت سماجی پہلو رکھتی ہے اور اس کا مطلب حفظِ مراتب کا لحاظ رکھنا ہے۔ نواب جہانگیر یہی غلطی کر رہا ہے کہ وہ اپنے تعلقات میں محتاط نہیں ہے۔ وہ برابر کے لوگوں سے تعلق استوار کرنے کی بجائے اپنے سے کم تر درجے کے فرد سے جذباتی تعلق قائم کر رہا ہے۔ جب وہ کیسری سے شادی کے انتظام کا حکم دیتا ہے تو بڑی بوڑھیوں کے ہاں اس پہ کافی لے دے ہوتی ہے اور اس کی ماں بھی اس حرکت کو "خلافِ شان" قرار دیتی ہے۔ وہ نواب کو سمجھاتی ہے کہ "اچھی ہڈی "اور "بری ہڈی "میں فرق ہوتا ہے۔ یہ سماجی تصور زمان و مکان سے ماورا چند بنیادی اوصاف کا انتساب کسی خاص نسلی گروہ پہ کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجوزہ نسل سے تعلق رکھنے والے تمام افراد یکساں صفات کے حامل ہیں اور تاریخ گزرے یا مقام بدلے ان صفات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ ذہن نشین رہے کہ نسلی گروہ کی کمتری کا زیادہ تر تعلق اخلاقی کہتری سے جوڑا گیا ہے۔ مغرب کے تصورِ نسل کے برعکس جہاں جلد کا رنگ کسی نسلی گروہ کے تعین کا ایک اہم ترین پیمانہ ہوتا ہے، اردو ناول میں زیادہ تر رنگ کی بجائے اخلاقی اور داخلی صفات کو بطور متعینہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں عموماً کہتر نسل کی خواتین پر کشش ہیں، اور یہ ذہن نشین رہے کہ ایسے معاملات میں زیادہ تر دو مختلف نسلی گروہوں کی عورتوں کے درمیان امتیاز واضح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ثنوی متضاد جوڑے بنا کر اپنے مبینہ تصورِ نسل کا ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ پہلو سامنے رہے کہ ناول نگار کا اپنا گروہی (نسلی) پس منظر اس کے کلامیے کی تشکیل میں

کار فرما ہے، جس نے کلامیے کے حدود متعین کیے ہیں اور خود ناول نگار کی پوزیشن بھی واضح ہو رہی ہے۔ یہ اس امر کی طرف کی اشارہ ہے کہ کلامیے کی تشکیل میں پیدا کار کا بنیادی کردار ہے اور تحریری کلامیے کو کنٹرول کرنے اور اسے اپنی آئیڈیالوجی کے فروغ کا ذریعہ بنانے میں اس کے اختیار کو بڑی حد تک دخل ہے۔ کلامیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کرداروں کے بارے اس نوع کے نسلی اور اخلاقی فیصلوں میں مصنف کے نسلی اور سماجی گروہی پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ہم نے کلامیاتی تجزیے کو استعمال کرتے ہوئے اردو ناول میں موجود شوی فکر کے دو بنیادی ماڈلوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس جائزے سے واضح ہے کہ سماج اور اس کے مختلف مظاہر ادبی دنیا میں تشکیل پانے والے کلامیے کو متاثر کرتے ہیں۔ اس لیے ادبی تحریروں کو غیر سیاسی یا غیر سماجی سمجھنا، یا انھیں محض جمال پارے تصور کرنا یا تخلیق کار کے جمالیاتی تصورات کا تحریری اظہار سمجھنا لسانی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں سے نظریں چرانے کے مترادف ہے۔

حوالہ جات

1. Ferdinand De Saussure, Course in General Linguistics, edited by Charles Bally and Albert Sechehaye, Translated by Wade Baskin (New York, Toronto, London: McGraw-Hill Book Company, 1966).
2. Norman Fairclough, Language and Power, 3rd ed. (New York: Routledge, 2015)

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، تعبیر کی شرح، اکادمی ادبیات، کراچی، ۲۰۰۵

4. Norman Fairclough, Language and Power, 51.
5. Ibid, 6.

۶۔ نواب سید محمد آزاد، نوابی دربار، مرتبہ ممتاز منگلوری مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۶۶

7. "The myth is a mechanism that deals with unresolvable contradictions by depending on simple and recognizable meanings within a culture that reinforces and challenges social understandings." David Wigston, "Narrative Analysis" in Pieter J Fourie, ed. Media Studies: Content, Audiences and Production, Vol. 2 (Lansdowne: Juta Education, 2015), 152
8. Ian P. Watt, the Rise of the Novel: Studies in Defoe, Richardson, and Fielding (London: Chatto & Windus, 1957)

۹۔ فتح محمد ملک، اندازِ نظر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹

۱۰۔ محمد نعیم، "مراۃ العروس: نسوانی اختیار اور مردانہ اصلاح" بازیافت، شمارہ ۲۵ (۲۰۱۴): ۸۴-۱۷۷

۱۱۔ سمیرا عمر، "اردو ناول میں عورت کی سماجی پیشکش" (یونیورسٹی آف سرگودھا: مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ۲۰۲۱)

12. A. S. Kalsi, "The Influence of Nazir Ahmad's Mirat Al-'Arus (1869) on the Development of Hindi Fiction," Annual of Urdu Studies 7, (1990): 31-44.

۱۳۔ منشی محمد جمیل الدین متخلص بہ نیر، آرسی مصحف منشی نول کشور، لکھنو، ۱۸۸۸، ۶

۱۴۔ ایضاً، ۲۔

15. Fairclough, 2015, 70

۱۶۔ سر سید احمد خان، اسبابِ بغاوتِ ہند

۱۷۔ محمد نعیم، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ: ۱۸۶۹ تا ۱۹۴۷، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹

18. Robin O. Andreasen, "Biological Conceptions of Race" in Philosophy of Biology, eds. Mohan Matthen & Christopher Stephens (Oxford: North-Holland, 2007), 56-63.Essentialism is the view that certain categories (e.g., women, racial groups, dinosaurs, original Picasso artwork) have an underlying reality or true nature that one cannot observe directly. Furthermore, this underlying reality (or "essence") is thought to give objects their identity, and to be responsible for similarities that category members share.Susan A. Gelman, Essentialism in everyday thought, Psychological Science Agenda | May 2005, https://www.apa.org/science/about/psa/2005/05/gelman

۱۹۔ عبد الحلیم شرر، آغا صادق کی شادی، سلطان حسین تاجر کتب، بمبئی س ن، 1902، ص ۵۶۔

۲۰۔ ایضاً، ۱۰۵۔

21. Imtiaz Ahmad, Caste and Social Stratification among Muslims in India Manohar, 1978, Delhi

۲۲۔ عبد الحلیم شرر، آغا صادق کی شادی، ۱۰۷

23. Rémy DELAGE, "Muslim Castes in India" in Books & Ideas.net, Trans. By Susannah Dale https://booksandideas.net/IMG/pdf/20140929_castesmusulmans_delage.pdf Accessed on 12 December 20222

References in Roman Script:

1. Ferdinand De Saussure, Course in General Linguistics, edited by Charles Bally and Albert Sechehaye, Translated by Wade Baskin (New York, Toronto, London: McGraw-Hill Book Company, 1966).
2. Norman Fairclough, Language and Power, 3rd ed. (New York: Routledge, 2015)
3. Shams Ur Rehman Farooqi, Tabeer Ki Sharah, Acadmey Adbiyat, Karachi, 2005
4. Norman Fairclough, Language and Power, 51.
5. Ibid, 6.
6. Nawab Syed M.Azad, Nawabi Darbar, Murattaba Mumtaz manglori, Maktaba Khayaban e Adab, Lahore, 1966

7. "The myth is a mechanism that deals with unresolvable contradictions by depending on simple and recognizable meanings within a culture that reinforces and challenges social understandings." David Wigston, "Narrative Analysis" in Pieter J Fourie, ed. Media Studies: Content, Audiences and Production, Vol. 2 (Lansdowne: Juta Education, 2015), 152
8. Ian P. Watt, the Rise of the Novel: Studies in Defoe, Richardson, and Fielding (London: Chatto & Windus, 1957)
9. Fateh M Malik, Andaz e Nazar, Sang e Meel Publications, Lahore, 1999
10. Muhammad Naem, Mirat Ul Aroos: Niswani Akhtiar awr Mardana Islah" Bazyaft, Shumara 25, 2014, P 84-177
11. Sumaira Ijaz, Urdu Novel Mein Awrat ki Samaji Paishkash, University of Sargodha, PHD Thesis, 2021.
12. A. S. Kalsi, "The Influence of Nazir Ahmad's Mirat Al-'Arus (1869) on the Development of Hindi Fiction," Annual of Urdu Studies 7, (1990): 31-44.
13. Munshi Jameel Ud Din Mutakhalas ba Nayyer, Arsi Mushaf, Munshi Nawal Kishoor, 1888, P 6
14. Ibid, Page 74
15. Fairclough, 2015, 70
16. Sir Syed Ahmad Khan, Asbab Baghawat e Hind.
17. Muhammad Naem, Urdu Noval Ka Saqafti Mutala 1869-1947, Kitab Mahal Lahore, 2019.
18. Robin O. Andreasen, "Biological Conceptions of Race" in Philosophy of Biology, eds. Mohan Matthen & Christopher Stephens (Oxford: North-Holland, 2007), 56-63.Essentialism is the view that certain categories (e.g., women, racial groups, dinosaurs, original Picasso artwork) have an underlying reality or true nature that one cannot observe directly. Furthermore, this underlying reality (or "essence") is thought to give objects their identity, and to be responsible for similarities that category members share.Susan A. Gelman, Essentialism in everyday thought, Psychological Science Agenda | May 2005, https://www.apa.org/science/about/psa/2005/05/gelman
19. Abdul Haleem Sharar, Agha Sadiq ki Shadi, Sultan Hussain Tajir Kutab,Bombai, 1902, P 56
20. Ibid, Page 125
21. Imtiaz Ahmad, Caste and Social Stratification among Muslims in India (Delhi: Manohar, 1978Ibid, Page 247
22. Abdul Haleem Sharar, Agha Sadiq ki Shadi, P 107
23. Rémy DELAGE, "Muslim Castes in India" in Books & Ideas.net, Trans. By Susannah Dale https://booksandideas.net/IMG/pdf/20140929_castesmusulmans_delage.pdf Accessed on 12 December 2022

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.276

ڈاکٹر ساجد جاوید

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا۔

تاریخِ ادبِ اردو از جمیل جالبی: تکنیک، معیار اور مسائل اور حدود

Dr. Sajid Javed
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Sargodha, Sargodha.

Jameel Jalibi's History of Urdu Literature; The Techniques, Standard and Limitations, A Critical and Research Analyses

ABSTRACT

History of Urdu literature has been a very phenomenal subject of Urdu research. Our book-shelves are adorned and well equipped with esteemed writings of esteemed historians of Urdu language and literature. It is the subject of keen importance to analyze, compare, value and put them on the touch-stone of modern research that invites the critic to highlight the right areas where the historians have done exceedingly well and find genuine requisitions, still deemed necessary to revise the existing history works. Jameel Jalibi is the most famous and well-read historian of Urdu language and literature among the all. His (book series) "Tareekh-e-Adab-e-Urdu" consisting of 4 volumes keeps the place amongst highest ranks of history of Urdu. In this article, the technique of all of his four volumes has been discussed chronologically, critically and analytically.

Keywords: *Jameel Jalibi, History of Urdu Literature, Tareekh -e-Adab-e-Urdu, Standards and Limitation..*

اردو ادب کی مستند اور معیاری تاریخ کی بات کی جائے تو چند ایک تواریخ کو اس ضمن میں بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے جن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی چار جلدوں پر مشتمل کتاب "تاریخ ادب اردو" سر فہرست آتی ہے۔ قریب نصف صدی سے یہ کتاب اپنی مثال آپ بن کر اس روایت کا حصہ ہے۔ "آب حیات" سے لے کر مذکورہ تاریخ تک

Received: 04th Aug, 2022 | Accepted: 11th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022

DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

تکنیکی طور پر مختلف تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ لیکن مسائل جوں کے توں ہی رہے۔اس میں سب سے اہم عنصر ادبی تاریخ کا ادوار بندیوں میں تقسیم کر کے ادیبوں کو کسی خاص دائرہ بحث میں لانا اور پھر اگلا دائرہ بنا کر ادبی روایت کو توسیع دیتے رہنا ہے اور یہ مورخین کا محبوب طریقہ کار ٹھہرا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بنائے گئے ادوار بندی کے ماڈل کو آنے والے عہد کے مورخین نے من و عن اپنائے رکھا۔ جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" آگے چل کر وہ موڑ ثابت ہوتی ہے جہاں اس سے آگے بڑھ کر تکنیک کی سطح پر متنوع تبدیلیاں پیش نظر رکھ کر ادبی تاریخ نویسی کا منصوبہ بروئے کار لایا گیا۔ چار جلدوں میں منقسم "تاریخ ادب اردو" اپنے مشمولات کے حساب سے حوالے کی چیز ہے مگر اس کے فنی محاسن کو دیکھا جائے تو ادراک ہوتا ہے کہ چاروں جلدوں میں تکنیک کے مختلف ماڈلز پیش کیے گئے ہیں جو اپنے چند معائب اور جملہ محاسن کی بدولت اس مقالے کا موضوع بن رہے ہیں۔

"تاریخِ ادبِ اردو" کے ہیئتی ڈھانچے کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جمیل جالبی نے اردو ادب کی پانچ سو سالہ تاریخ اور آٹھ سو سالہ روایت کو بیان کرنے کے لیے پوری کتاب کو چار سے چھے فصلوں میں تقسیم کیا ہے جو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ایک ہی فصل میں مذکورہ عنوان کو اس کے عہد کی ممکنہ تمام جہات، اہم اصناف، ادبی شخصیات اور تہذیبی، سماجی اور تاریخی ڈھانچے کو باہم آمیخت کرتے ہوئے ایک وحدت بنانے کی سعی کی ہے۔ اس لیے جب وہ کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے درج بالا عوامل کے منطقی انسلاک کو ایک وحدت بنا کے پیش کیا ہے تو راقم کے خیال میں یہ بات یہ دعویٰ ایک دو فصلوں کی حد تک درست ہے لیکن اس جلد کے تمام مشمولات پر یہ بات پوری طرح صادق نہیں آتی۔

اصل میں اس وقت تک مربوط ادبی تاریخ کا تجربہ بہت حد ممکن اس طور نہ ہوا تھا۔ یونیورسٹیز میں ابھی تحقیق کا عمل اتنا فراواں نہیں تھا کہ محقق ایک صدی یا ربع کی مربوط نثری و شعری روایت سے فن پارے علیحدہ علیحدہ کر کے سمجھتا۔ دوسرا یہ کہ اس وقت تک ادبی تاریخ نویسی کے اصول اور ضابطے بھی پوری طرح سماج میں مروج نہ تھے اسی لیے مذکورہ تاریخ میں نہ صرف نثر اور شعر پارے الگ الگ فصلوں میں منقسم نظر آتے ہیں بلکہ بعض جگہ کسی علاقے کی روایت کی تفصیل کے عمل میں ان کا اپنا تسلسل بھی دھندلا پڑتا دکھائی دیتا ہے جسے اس طور نظر انداز کرنا ضروری ہے کہ ابھی تک ادبی تاریخ نویسی تو شخصیت کی رو سے ادوار میں بٹی ہوئی تھی یا علاقائی جزوی تاریخوں کے نمونوں میں موجود تھی یا محض اردو سے قبل کی کھڑی بولی اور برج بھاشا بولیوں کو اردو ثابت کرنے کے نمونوں میں ملتی تھی یا ادیبوں کے تعارفی جائزوں تک محدود مختصر تاریخ منظر عام پر آتی تھی۔

"آبِ حیات" (مولانا محمد حسین آزاد) سے لے کر "تاریخ ادب اردو" (جالبی) تک قریب قریب ایک

صدی کا ارتقائی سفر ہمارے مطالعے میں آتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان تمام ادبی شخصیات کی شخصی و علمی عظمت کا اقرار اپنی جگہ، کوئی مورخ ہمیں تصویری مرقعے دکھانے میں مشغول نظر آتا ہے کوئی منثورات کے نمونے اکٹھے کر کے جزوی تاریخ سامنے لاتا ہے، کوئی مختصر ادبی تاریخ کا فریضہ نبھاتا ہے تو کوئی ہمیں نصابی ضروریات کے لیے طلبا اور طالبات کا نصاب نامہ بناتا ہوا نظر آتا ہے اور احتشام حسین تک آتے آتے ایک نقاد ان تواریخ پر اور ان کی تصنیف، تالیف پر تنقیدی محاکمہ دیتے ہوئے کچھ اصول واضح کرتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ مکمل تو درکنار، پختہ نقش کرنے میں بھی بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوتی۔ ایسے میں ضرورت پیش آتی ہے کسی ایسے مورخ کو جو اس ضمن میں روایت کا شعور بھی حاصل کرے اس کے معائب کو تاریخ نویسی سے صاف بھی کرے، تسامحات کی اصلاح کرتے ہوئے کوئی ایسا نقش پیش کرے جو تاریخ کے طالب علم کے لیے بھی معاون ہو اور تاریخ کے سکالر کی رہنمائی کرے لہٰذا ادبی تاریخ کا معتبر نمونہ بھی پیش کرے اور یہ کام کرتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی، "تاریخِ ادب اردو" کی صورت میں وہ شاہکار پیش کرتے ہیں جو آج اپنی پہچان کے عروج پر ہے پہلی جلد جو کہ ۱۹۷۵ میں شائع ہوئی اس کے دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کی اس تاریخ سے کیا منشا ہے۔ چند نکات جو سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

اول۔ واضح رہے کہ یہ جدید انداز کی مربوط ادبی تاریخ ہے۔

دوم۔ قدیم ادب کا مطالعہ تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور لسانی عوامل کے تحت کیا گیا ہے۔

سوم۔ ادب کی تاریخ ایک اکائی بنائی گئی ہے (بقول جالبی) جسے ایک ٹکڑے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

جمیل جالبی نے روایت سے جڑے رہتے ہوئے "تاریخِ ادب اردو" جلد اول کے پہلے باب میں اردو زبان کے تاریخی تغیرات اور تشکیل کی بحث سے آغاز کیا ہے جو کوئی انفرادیت پر مبنی بات نہیں۔ دیکھا جائے تو اردو کی پہلی ادبی تاریخ "آبِ حیات" سے اردو زبان کی لسانی تشکیل کے مختلف عوامل اور مراحل کے موضوع کو ادبی تاریخ نویسی کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ گو اصولی طور پر یہ باب ادبی تاریخ کا براہِ راست حصہ نہیں بنتا لیکن کسی مورخ کے لیے اس بات کی گنجائش ادبی تاریخ نویسی کی تکنیک میں موجود ہوتی ہے کہ اس کو ثابت کیا جا سکے۔ اس لیے تاریخ کی تدریس میں بھی ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ پڑھاتے ہوئے طالب علم کو بھی ہمیں ان لسانی مباحث کی مدد سے تاریخ سمجھایا جانا آسان دکھائی دیتا ہے۔ بالکل اسی طور مورخ سمجھتا ہے کہ اس کا قاری ادبی تاریخ کی قرات کے لیے تو تیار ہے لیکن شاید تاریخی لسانیات کے جملہ مباحث اس کے لئے ادق ہوں، اس لیے زبان کا کسی ضمیمے میں ذکر کر دینا تکنیکی ہنر بنتا ہے عیب نہیں۔ لیکن راقم کے اس لسانی جواز کے برعکس رشید حسن خان نے اپنے ایک مضمون میں اس طریقے کو بنظر استحسان نہیں دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس کتاب کا نام "تاریخ ادب اردو" ہے مگر پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ جلد اول ۱۷۵۰ء تک کے قدیم ادب اور زبان کا احاطہ کرتی ہے۔ زبان اور ادب کے اس غلط مبحث نے زبان کی بحث کو تضادات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ یقیناً زبان و ادب کا باہمی تعلق ہے، لیکن تاریخ نگاری کے لئے زبان اور ادب بجائے خود دو مستقل موضوع ہیں اور دونوں کے مختلف تقاضے ہیں"۔[۱]

ان امور پر بحث کرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ کسی مورخ نے گجرات دکن کے قدیم ادب کو الگ الگ دیکھنے کی بجائے ایک لڑی میں پروتے ہوئے دیکھا جس سے بہر طور دونوں خطوں کے لسانی اور ادبی سرمائے کی اہمیت اور تفہیم کا اندازہ لگایا جانا سہل ہو سکا۔ اصل میں ایک ہی عہد میں گجرات اور بہمنی سلطنت کے دکن میں لسانی تبدیلیاں وقوع پذیر تھیں۔ گجرات میں مذہبی موضوعات کے لئے زبان کا استعمال تاریخ کا حصہ بن رہا تھا جبکہ دکن میں دکنی شاعری کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔ اب ان دونوں خطوں کو الگ سے بھی دیکھا جا سکتا تھا لیکن انکی تکنیک کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں کو لسانی اور ادبی تغیرات کے تحت زیر بحث لانا زیادہ مناسب خیال کیا۔ فیضان شاہد اپنے تحقیقی مقالے میں تحریر کرتے ہیں:

"جمیل جالبی نے گجرات اور دکن کے ادب کو پہلی بار سیاسی اور تاریخی و ثقافتی پس منظر کے ساتھ اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی کہ ایک مکمل مبسوط روداد کی شکل نظر آتی ہے۔ ادب میں پڑاؤ، ادب کی توسیع، ادبی روایات کے قیام اور ردو بدل سے ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔"[۲]

ان تمام خصائص کے باوصف اس جلد کی تکنیکی بنت دیکھی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ساڑھے سات سو سال کی بالترتیب لسانی، ادبی، تہذیبی اور سماجی تاریخ کی پیش کش سے قریب قریب آٹھ سو صفحات تحریر کیے۔ کُل فصلیں چھے ہیں اور واضح رہے کہ تمام کتب کے مشمولات چار سے چھے فصلوں میں یکجا کیے گئے ہیں۔ ہر فصل چونکہ ایک عہد، ایک تہذیب اور ایک مرکز کا بیانیہ ہے اس لیے اس فصل کے مختلف ابواب میں ہی تمام معلومات کو شامل کیا گیا ہے۔ ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتا چلوں کہ جلد اول کے آخر میں پاکستان کے اردو کے عنوان کے پانچ ابواب ملتے ہیں جن کے نام یوں ہیں: پنجاب میں اردو، سندھ میں اردو، لسانی اشتراک (اردو، پنجابی، سرائیکی، سندھی)، سرحد میں اردو روایت، بلوچستان میں اردو روایت۔ راقم ان ضمیموں کی موجودگی کے بارے میں سوچتا سوچتا اس نتیجے پہ پہنچا ہے کہ جالبی نے اس سے دو کام لیے ہیں ایک تو یہ کہ پاکستان میں اردو زبان و ادب کی روایت سے قومی

یکجہتی پہلو سامنے لایا جائے دوسرا اس پانچویں جلد کا ایک اشاریہ سامنے لانا بھی مقصد ہو سکتا ہے جو ان کے ذہن میں تھا لیکن کاغذ پر منتقل نہ ہو پایا۔ ڈاکٹر غلام رسول ساجد نے اپنے پی ایچ۔ڈی کے تھیسز میں سرحد میں اردو کے ضمیمے کو بے مقصد سمجھتے ہوئے اس کو تنقیص کے دائرے میں رکھا ہے۔[۳]۔ یہ بھی واضح ہے کہ مورخ کا لسانی معلومات بہم پہنچانا ایک مثبت عمل ہے لیکن ادبی تاریخ میں ماہرِ لسانیات بن کر محاکمہ سازی کرنا ادبی تاریخ کی کوئی خدمت نہیں اس لیے جمیل جالبی سے قبل کی اس روایت کو اس مقولے کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ضمیمہ جات میں پاکستان کے صوبوں پر مضامین شائع کرنے پر گیان چند جین ان الفاظ میں رائے دیتے ہیں:

> "چار علاقوں کے ادب کا ضمیمے میں بیان کرنا خاکہ نگاری کا بہترین طریقہ نہیں۔ اول تو ضمیمے کا مجموعی عنوان "پاکستان میں اردو" ہی قابل اعتراض ہے۔ پاکستان اگست ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ اس سے پہلے کے ادب کو کس طرح پاکستان کا ادب کہہ سکتے ہیں۔ جالبی صاحب جب دور حاضر کی آخری جلد لکھیں اور اور اس میں تقسیم ملک کے بعد کے علاقہ پاکستان کے ادب کا بیان کریں تو عنوان "پاکستان میں اردو" مناسب ہو گا۔ انھوں نے جلد اول کو بنیادی طور سے بانٹا ہے۔ فصل اول شمالی ہند، فصل دوم گجرات، فصل سوم تا ششم دکن۔ پھر ان فصلوں کی زمانی تقسیم کی ہے۔ انہی کے بیچ حسب موقع پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے ادیبوں کے لیے جگہ نکالنی چاہیے تھی۔"[۴]

جلد دوم کی مشمولات کا اندازہ لگایا جائے تو اندازہ ہوتا ہے اس جلد کی اہمیت اس طور زیادہ ہے کہ اس میں کم و بیش پوری اٹھارہویں صدی کی ادبی روایات اور رجحانات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ایک جملے میں اس کتاب کو سمیٹا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں "سارے کلیات، ساری تصانیف، کم و بیش سارے اصل تاریخی، ادبی و غیر ادبی ماخذ سے براہِ راست استفادہ کر کے روحِ ادب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور پوری ذمہ داری، شعور کے ساتھ کم سے کم لفظوں میں اسے بیان کر دیا ہے۔ اس کتاب میں یہ اہتمام نظر آتا ہے کہ ثقافت، فکر اور تاریخ کے تخلیقی امتزاج سے تاریخِ ادب کو ایک وحدت، ایک اکائی بنانے کی کوشش کی ہے۔

اس جلد کی فہرستِ مشمولات کا جائزہ لینے سے ایک اہم بات جو ہمیں نظر آتی ہے وہ اس کی تکنیک ہے جس کے بارے میں راقم کا یہ خیال سوال بن کے سامنے آتا ہے کہ اس اہم صدی میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثری نمونے بھی سامنے رکھے ہیں لیکن یہ کہ تکنیک میں نمایاں تبدیلی بروئے کار نہ لا سکے اور روایتی ڈھانچے کو ہی پیشِ نظر رکھا وہ

یوں ہے کہ اس سے قبل شاعری اور نثر کی تواریخ کو الگ الگ رکھ کر حصے بنا دیے جاتے تھے، اسی طور پہ جلد دوم کے گیارہ سو صفحات میں ہمیں کتاب کے دو غیر متوازن حصے نظر آتے ہیں جن میں پانچ سو صفحات شمالی ہند کی ابتدائی شعری روایت سے لے کر ایہام گوئی کے رد عمل کی تحریک تک کے شعرا اور کلام کا احوال موجود ہے۔ اس حصے میں کتاب میں کُل چھے فصلوں میں سے چار فصلوں کا مواد تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اگلا حصہ جسے میں سہولت کے لیے دوسرا حصہ کہوں گا اس میں تقریباً پانچ سو صفحات پر صرف ایک فصل شامل کی گئی ہے جس میں رد عمل کی توسیع کے عنوان کے تحت میرؔ و سوداؔ سے لے کر جعفر علی حسرتؔ، ہیبت قلی خان، حسرتؔ جیسے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جو تکنیک کی خامی کہا جائے تو بے جا نہ لگے۔ اہم بات یہ ہے کہ فصل ششم کے ایک سو صفحات میں اس صدی کی اردو نثر کی تفصیل موجود ہے جس میں مذہبی نثر، قرآن کے تراجم، مستشرقین کی مشنری و سیاسی اہمیت کی نثری کتب کا ترجمہ، "بھگوت گیتا" اور آگے چل کر "قصہ مہر افروز و دلبر"، "نوطرزِ مرصع"، "نو آئینِ ہندی"، "عجائب القصص" وغیرہ کا مختصر ذکر موجود ہے جو اتنے کم صفحات میں پیش آیا ہے کہ تاریخ نویسی کے نقاد کو خوش نہیں آیا۔ اشاریہ کے الگ سے سو صفحات کتاب کا حصہ نہیں جو کم کیے جا سکتے تھے پر نہ ہوئے۔ ڈاکٹر غلام رسول ساجد اپنے پی ایچ ڈی تھیسز میں ایک اہم نکتہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے مطابق:

> "جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو، کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ زبان کا کوئی تدریجی ارتقا نہیں بلکہ شاعری اور نثر نگاری کے تدریجی ارتقا کا خاکہ کچھ تبصروں اور مختلف لوگوں کی آرا کے اعتبار سے ابھرتا ہے۔ لیکن زبان کا ارتقائی عمل، اظہاری صلاحیت سے پہلے کس طرح رونما ہوتا آیا ہے۔۔۔ کون سے عناصر اور جذبات نے زبان کو اتنی قوت سے مالامال کیا ہے جس کے سبب یہ زبان اظہاری قوتوں کی تکمیل تک معقول اسباب فراہم کرنے کے قابل ہو گئی، ایسے تصورات اس تاریخ سے زندہ نہیں ہوتے۔"(۵)

جلد دوم کی ایک خصوصیت جو اس کو باقی تواریخ سے الگ کرتی ہے وہ ایک باب غیر ایہام گو شعرا کے تذکرے کا ہے جن کو ادب کے مورخ عام طور پر نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں، ان شعرا میں اشرف گجراتی، محمد رضی رضی، ثناءاللہ ثنا، سید محمود صابر، عبدالولی عزلت وغیرہ کے نام موجود ہیں۔ ادبی تحقیق کا شناور اگر اس باب کے مشمولات پر تجزیاتی مطالعہ کرے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس عہد میں ہم ہر طرف ایہام گو شعرا کی شوخی و شرارت بھری ادبی روایت سے بہرہ ور ہو رہے ہوتے ہیں اس عہد میں مرکز کے اندر اور ذرا دور شعرا کس طور اور کس

انداز سے شعری ادب کی تخلیق میں کوشاں تھے۔ صرف ایک فصل پنجم کے پانچ سو صفحات میں میر تقی میرؔ کو دو ابواب کے ڈھائی سو صفحات میں پیش کرنا، رفیع سودا کو اسی صفحات اور میر دردؔ کو چالیس صفحات میں پیش کر کے لکھنو سمیت باقی شعرا کو ایک سو ستر صفحات میں نمٹا دینا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جالبی لکھنے پر آئے تو لکھتے چلے گئے اور بنا کاٹ چھانٹ کے ہر معلوم معلومات کو صفحات کا حصہ بناتے چلے گئے۔

ان دونوں جلدوں کی اہمیت پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری رائے دیتے ہوئے خراج تحسین ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "یہ دونوں حصے آغاز سے اٹھارہویں صدی کے خاتمے تک ادب اردو کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ یہ پہلی تاریخ ہے جس میں اردو ادب کو مختلف ادوار کی مختلف اکائیوں کی شکل میں نہیں بلکہ ادب کی ایک مربوط تاریخی روایت کی صورت میں دیکھا گیا ہے۔ مصنف کے تبحر علمی، تحقیق و تنقید پر یکساں قدرت، محنت شاقہ اور ذہنی بصیرت نے اس تاریخ کو ایک بے مثال تاریخ کا مقام عطا کیا ہے۔ یہ اردو ادب کی واحد تاریخ ہے جس میں تحقیق اور تنقید کا ایک متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کام فرد واحد کی محنت کا نتیجہ ہے اس لیے میں اس علمی کام کو ایک ادبی معجزہ سمجھتا ہوں۔"(۶)

جلد سوم (۲۰۰۶) کے پیش لفظ کا مطالعہ کیجئے تو جمیل جالبی کا ایک اقتباس سامنے آتا ہے جس میں وہ اپنی چاروں جلدوں کی حد بندی کرتے ہوئے یوں تحریر فرماتے ہیں:

> "پندرہویں تا سترہویں صدی دکنی اردو ادب کی صدی ہے اور اٹھارہویں صدی مغلیہ سلطنت کے مرکز، دہلی کی صدی ہے۔ اسی طرح انیسویں صدی دہلی کے ساتھ بیشتر لکھنو کی صدی ہے۔ اس طرح بیسویں اردو زبان و ادب کے تعلق سے بیشتر پنجاب کی صدی ہے۔"(۷)

انیسویں صدی جو کہ حقیقت میں اردو کے صحیح طور پر ترویج و اشاعت کی صدی بنی اس کے ادب کو دو حصوں میں جلد سوم اور چہارم کو شامل کیا گیا ہے۔ تکنیکی ڈھانچے کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جلد سوم میں شامل پانچ فصلوں کے ایک ہزار صفحات میں کچھ تبدیلی نظر آتی ہے جو خوش آئند ہے اور تکنیکی جمود کے خاتمے کا اشارہ ہے۔ جب حسبِ سابق پہلی فصل شعرا کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور مصحفیؔ، جرأتؔ، انشاؔاللہ خاں اشکؔ، سعادت یار رنگینؔ، اور چند ایک غیر معروف ناموں ولی اللہ محبؔ، مرزا تقی خان ہوسؔ، جسونت سنگھ پروانہؔ، مہدی علی خاں، ذکی

مراد آبادی وغیرہ سے ہوتی ہوئی چار سو صفحات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس فصل میں مصحفیؔ وہ خوش نصیب شاعر قرار پاتے ہیں جن کا ذکر صفحہ نمبر ۶۵ سے شروع ہوتا ہے اور باقی شعرا کے ابواب میں بھی تقابل ہوتے ہوئے ۲۸۲ صفحات میں جزوی طور پر شامل ہو جاتے ہیں جو ایک غیر معمولی بات ہے۔ فصل دوم البتہ فورٹ ولیم کالج کے عنوان کے تحت نثری کتب کے احوال کی دنیا ہے جن میں جون گلکرسٹ، میر امن، بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری، مظہر ولا وغیرہ کے کے تفصیلی ذکر کے ساتھ فورٹ ولیم کالج ہر حوالے کی چیز بنتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ راقم نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے دوران اس حصہ کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شاید جالبی نے یہ حصہ دقتِ نظری سے نہیں دیکھا ہو گا کیوں کہ اس میں کئی مقامات پر مجھے کتب کی سطح کے تسامحات نظر آئے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ فصل سوم نثر کے تسلسل کا بیان ہے جس میں نو طرزِ مرصع اور فسانۂ عجائب کے درمیان کی کڑیوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس جلد میں دو سو ساٹھ صفحات کو نثری کتب کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ تکنیکی طور پر فٹ نوٹ کے بے جا استعمال پر بھی اجمالی بات کی جانی ضروری ہے۔ اس ذیل میں راقم اپنے نقطہ نظر کو گیان چند جین کے ان جملوں کے تابع کرتے ہوئے اقتباس پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اب مجھے ہیئتِ تسوید کے ایک نکتے پر بحث کرنی ہے۔ متن کے نیچے فٹ نوٹ (حاشیہ) کو کن مطالب کے لیے استعمال کیا جائے؟ محمد حسین آزاد نے کم اہم مصنفوں کے حالات لکھنے کے لئے حاشیے کا استعمال کیا۔۔۔ اردو کے ادیبوں کے ذہن میں فٹ نوٹ کا کوئی تعین نہیں، جس بات کو جی چاہا فٹ نوٹ میں ٹانک دیا۔ یہی کیفیت ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب کی ہے۔ یہاں بھی اکثر حواشی کے مطالب کو حاشیے میں جگہ دینے کی وجہ سمجھ نہیں آتی، مثلاً کئی مثنویوں کی تاریخ تصنیف کی بحث متن میں ہے، لیکن اسی سے متعلق کوئی جزو، مصرعِ تاریخ کا کوئی دوسرا نسخہ فٹ نوٹ میں درج کر دیا۔۔۔"(۸)

فصل چہارم میں ناسخؔ، آتشؔ کے دور پر نظر کرتے ہوئے سادہ گوئی کے خلاف رد عمل محققانہ تبصرہ موجود ہے اور اس رد عمل کو جالبی نے طرزِ جدید و تازہ گوئی کا رواج کے عنوان سے موسوم کیا ہے فصل چہارم کا مطالعہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں لکھنوی شعر و سخن، ڈرامہ نگاری، واسوخت کے ساتھ ساتھ آتش کی روایت کی توسیع، تکرار اور امتزاج ملتا ہے جس کی مثالیں محمد خان رندؔ، میر وزیر علی صبا، آغا جو شرف اور آگے چل کر پنڈت دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق کی مثنوی کے خصائص و فضائل میں ملتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ حصہ لکھنو کے متعلق جاننے اور محقق کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس جلد کی سب سے عجیب بات فصل پنجم کے پچاس

صفحات پر موجود دو ادیب ہستیاں ہیں جن میں سے ایک نام واجد علی شاہ کا ہے اور دوسرا نام جالبی کے لفظوں میں عوام کے اکلوتے فقیر نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ اور یوں یہ فصل اپنے ساتھ موجود چالیس صفحات کے اشاریے سے مکمل ہوتی ہے۔

راقم کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ کو بے شک مبتدی شخصیت قرار دیا جاتا لیکن اس کو لکھنو کے شعرا اور ادبا کے باب میں رکھا جاتا تو یہ فصل بنانے کی نوبت نہ آتی اور یوں ایک بادشاہ ادیب کے پچیس صفحات الگ نہ کرنے پڑتے کیوں کہ میں ٹھوس دلیل سے دعویٰ کرنے جارہا ہوں کہ نظیر اکبر آبادی کا ذکر یہاں پر آنا از حد غیر ضروری تھا۔ استادِ محترم ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں فرمایا تھا کہ تاریخ ادب میں نظیر اکبر آبادی کو کوئی مورخ فِٹ نہیں کر پایا۔ راقم نے اس پہلو کو بغور دیکھا تو اندازہ ہوا کہ واقعی نظیر اکبر آبادی ایک عظیم لیکن بدقسمت شاعر ہے۔ جس کو کوئی مورخ اپنی تاریخ میں جائز مقام و مرتبہ نہیں دے سکا۔ اس کتاب نے مجھے حیران کر دیا کیونکہ جلد سوم میں نظیرؔ کا ذکر بالکل بھی جائز نہیں آتا کیونکہ ۱۷۳۵ میں پیدا ہونے والے نظیرؔ اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ۶۵ سال کی عمر کو چھو رہے تھے (بے شک ان کی وفات ۱۸۳۰ میں ہوئی)۔ اب ایک معتبر اور میچور شاعر کا تذکرہ جلد دوم کے صفحات پر نہ کرنا ایک مورخانہ غلطی نہ بھی کہی جا سکے تو جالبی جیسے بڑے مورخ کے تاریخی شعور اور تاریخیت کے عمل پر سوالیہ نشان بنتا ہے۔ راقم جلد دوم کی فصل پنجم کے آٹھویں باب میں دوسرے شعرا کے عنوان سے دیے گئے سو صفحات سے ان شعرا کی جگہ پر نظیر اکبر آبادی کے پچیس صفحات جوڑ دیے جانے کی صلاح دیتا ہے جن میں ہدایت اللہ ہدایتؔ، میر محمدی بیدارؔ، شیخ رکن الدین عشقؔ، مرزا محمد علی فدویؔ، محمد روشن جوششؔ، شیر محمد خان ایمانؔ اور محمد عابد دلؔ جیسے غیر اہم شعرا کا ذکر موجود ہے۔ نیز ایک مورخ کو کیا امر مانع ہو سکتا ہے اگر جلد سوم میں بھی نظیر کے تذکرے سے کتاب شروع کی جاتی اور بے شک ۱۸۲۵ میں وفات پانے والے مصحفیؔ کا ذکر آخری فصل میں چلا جاتا۔ راقم کو یہ تسلیم ہے کہ مصحفیؔ کا ذکر آخری فصل میں عیب بن جاتا تو اسی کلیے پر میر امانا ہے کہ نظیرؔ اکبر آبادی کا تذکرہ آخر میں کرنا بھی جلد سوم کا تکنیکی عیب ہے جن کو درست کیا جانا ضروری ہے۔

تاریخ ادب اردو جلد چہارم کے مشمولات اصل میں انیسویں صدی کے ادب کا احاطہ کرتے ہیں۔ جلد میں کل چار فصلوں میں انیسویں صدی کے نصف آخر دور کا جزوی تفصیلی بیان ملتا ہے جس کا آغاز غالبؔ کے ادبی احوال سے ہوتا ہے۔ غالبؔ سے متعلق دو سو صفحات کے مواد میں غالبؔ کے احوال و آثار سے لے کر زندگی کے غیر ادبی واقعات، نیز فارسی تخلیقات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس کو مختصر کیا جا سکتا تھا۔ اردو ادب کی تفصیل اور اس پراجیکٹ کا تقاضا صحیح ہے لیکن فارسی مواد کو مختصر نہ کرنا غالبؔ کے بیان کو مستحکم ضرور کرتا ہے البتہ اس سے تاریخ کی

طوالت کو کم کیا جاسکتا تھا۔ تکنیکی طور پر یہ بات قابل غور ہے شاہ نصیر اور ذوق کا ذکر غالب کے بعد کے باب میں ملتا ہے۔ اس بات کو اگر جمیل جالبی کے معاصر تاریخ دان ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ میں دیکھا جائے تو ان کے ہاں شاہ نصیر کا تذکرہ غالب کے بیان سے پہلے ملتا ہے جو تاریخی اعتبار سے درست ہے۔

جلد چہارم کی تکنیک کا قابل غور پہلو یہ ہے فصل اول میں شاعر کے حوالے سے تاریخ کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جو اس ساری فصل کے بقیہ ابواب میں بھی تسلسل کے ساتھ ہے۔ شاہ نصیر، بہادر شاہ ظفرؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، اور آگے روایتی شعرا مہدی مجروح، قربان علی بیگ سالک، ظہیر دہلوی وغیرہ کی ذیل میں حالات و شاعری کے تحت ان شعرا کو زیر تحریر لایا گیا ہے۔ فصل دوم صرف مرثیہ کی صنف کے لئے مخصوص ہے جس کے تیرہ ابواب میں محض لکھنو کے مرثیہ گو شعرا کا ذکر شامل ہے۔ فصل سوم میں سلسلہ تحریر مزاحیہ نثر کے مشمولات پر محیط ہے جس میں اودھ پنچ کی روایت، منشی سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، سید آزاد کے مزاحیہ ادب کی تفصیل موجود ہے۔ اس میں ایک حصہ اکبر الہ آبادی کی نثر اور شاعری کا شامل ہے جس سے یہ فصل اس عہد کے مزاحیہ ادبی زاویوں کا اشاریہ بنتی ہے۔ فصل سوم کا دوسرا حصہ سرسید تحریک میں شامل اردو کے عناصر خمسہ کا تفصیلی تعارف لیے ہوئے ہے جو اپنی جگہ حوالے کی چیز ہے۔ ان پانچ ادبا کے ذکر پر قریب قریب چار سو صفحات کا مواد شامل ہے جس کے مطالعے سے نو آبادیاتی عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی زاویوں کو بخوبی دیکھا گیا ہے۔ اس مقام پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ فصل عجیب انداز سے بے ربطی کا نقشہ بن گئی ہے۔ اس میں نثری اور شعری ہر دو طرح کے مواد نے قاری کو الجھا کے رکھ دیا ہے۔ اس حصے میں سرسید تحریک کو الگ کر کے دیکھا جاتا تو تاریخ کے تسلسل میں بھی رخنہ نہ آتا اور روایتی شاعری کی ذیل میں شعرا کو بھی علیحدہ کر کے دیکھا جاسکتا تھا جو تاریخیت کے عنصر کو بھی کم کرتا ہے۔ فصل چہارم میں "داستان طلسمِ ہوشربا" اور "بوستانِ خیال" کا ذکر اس طور اہم بنتا ہے کہ ان دو داستانوں کو اٹھارہویں کے آخری ربع میں دیگر مورخین نے خاص اہتمام سے ذکر نہیں کیا۔ ان داستانوں کے ساتھ دیگر نثری اصنات جن میں سفر نامہ، مذہبی نثری کتب، شعرا کے تذکروں، نعت گوئی کی روایت اور کتب تواریخ میں اردو نثر کے فن پاروں کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے اور یوں قریب ساڑھے پندرہ سو صفحات پر مشتمل یہ جلد تاریخ ادب اردو کے سلسلے کی آخری لڑی بن کر اپنی اہمیت منوانے میں کامیاب رہی ہے۔

اب ایک تاریخ کی تکنیک، منہاج، حدود، مشمولات، ادبی تاریخ نویسی کی غائت اور خدوخال کو ڈاکٹر علی جاوید کی کتاب کا یہ پیراگراف بخوبی واضح کرتا ہے جس میں مختلف ماہرین تاریخ نویسی کی تعریفوں کے اہم اجزا یکجا کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ادبی تاریخ کا تصور دراصل ہمیں مغرب سے ملا۔ کچھ لوگ اسے اجتماعی تاریخ سمجھتے ہیں

یاافکار کی تاریخ جس میں فن پاروں پر محاکے شامل ہوتے ہیں۔ ٹامس وارٹن کے نزدیک ادبی تاریخ اپنے دور کی خصوصیات کو بے کم و کاست پیش کرتی ہے۔ ہنری مارلے نے اسے ایک طرح کی قومی سوانح عمری کہا ہے، سینٹس بری نے اسے ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ سمجھا ہے جس میں ان کارناموں کی بازآفرینی ہو۔۔۔ ٹی ایس ایلیٹ ادبی تاریخ کا کچھ قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فن پارے کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ ماضی بن سکے۔ جے اے سمینڈز ادبی اصناف پر زور دیتا ہے اور یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ ادبی اصناف کا ارتقا ادبی تاریخ کا سب سے اہم جزو ہے کیونکہ امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ ادبی اصناف مرجھا جاتے اور بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔"(۹)

ہمارے نقاد اور محقق کے جدید طرز کے مطالعہ کو ان تحقیقی استفسارات کی حقیقت اور ازاں بعد ان کے حل ڈھونڈنے میں کوشاں ہونا ہو گا۔ اکابرین ادب کے کام کو مدح سرائی کے دائرے سے نکلنا ہو گا۔ توجہ طلب تحقیقی خلاؤں کو نئے سرے سے پُر کرنے کی کوشش ہمارے آئندہ قاری کی تفہیم کی درست سمت کا تعین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ امر بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ چار سو سال کی مربوط ادبی تاریخ کو تیکنیک کی کسی یکساں حد بندی میں رکھ کر نبھایا جانا مشکل امر ہے لیکن ابواب بندی کے کسی بھی پیش کیے گئے منصوبے کی توضیح اور توجیہہ کے متعلق بات کرنا کسی بھی مورخ کا اخلاقی فریضہ بنتا ہے اور اس سے مستقبل کا مورخ رہنمائی بھی حاصل کر سکے گا۔ جمیل جالبی کے اس تاریخ میں پیش کئے گئے متن (مواد) اور تحقیقی معیارات پر الگ سے بات کرنے کی ضرورت بھی نقادان (ادبی) تاریخ نویسی پر لازم ہے جس سے معروضی انداز سے عہدہ برآ ہونا خوش آئند امر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ،، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۸، ص ۲۹۳

۲۔ فیضان شاہد، اردو ادب کی تاریخ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، مخزونہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء ص ۲۰۹

۳۔ غلام رسول ساجد، ڈاکٹر، اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ،، فاطمہ آرٹ سا کی ناکہ، برہان پور انڈیا، ۱۹۹۷، ص ۷۹

۴۔ گیان چند جین، اردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۶۸۵

۵۔ غلام رسول ساجد، ڈاکٹر، ص ۷۷

۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹، ص ۱۴
۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، مجلس ترقی ادب،، لاہور، ۲۰۱۳ء، طباعت سوم) ص ۱۵
۸۔ گیان چند جین، ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو مطبوعہ ماہنامہ قومی زبان، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۱۹، ص ۸۵
۹۔ علی جاوید، ڈاکٹر، برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۲ص ۱۸-۱۹

References in Roman Script:

1. Rasheed Hassan Khan, Adabi Tahqeeq, Masael o Tajziya, Educational Book House, Ali Garh, 1978, P.293
2. Faizan Shahid, Urdu Adab ki tareekh Nigaari ka Tahqeeqi o Tanqeedi Mutala, Ghair Matbooa Maqalat Baraey PhD. Makhzoona Jamia Miliiya Islamaiya, New Dehli, 2016,P.209
3. Ghulam Rasool Sajid, Dr, Urdu ki Muntakhib Tareekhon ka Tanqeedi jaeza, Fatima Art saki naka, Burhan Pur, 1997, P.79
4. Gayan Chand Jean, Urdu Ki Adabi Tareekhein, Anjuman Taraqqi e Urdu, Pakistan, Karachi, 2000, P.685
5. Ghulam Rasool Sajid, Dr, P.77
6. Tabassum Kashmiri, Urdu Adab Ki tareekh, Sang e Meel Publications, Lahore, 2009, P.14
7. Jameel Jalbi, Dr, Tareekh e Adab e Urdu, Jild Soum,Majlis Taraqqi e Adab, Lahore, P.15
8. Gayan Chand Jean, Dr. Jameel Jalbi, Tareekh e Adab e Urdu Matbooa Mahnama, Qaoumi Zaban, Anjumnan Taraqqi e Urdu, Karachi, 2019, P.85
9. Ali javed , Dr,Bartaanvi Mustashriqeen awr Tareekh e Adab e Urdu, Samar Offist Press, New Dehli, 1991, P.18-19

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.277

ڈاکٹر شگفتہ فردوس

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، ڈائیریکٹر اسٹوڈنٹس افیئرز، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ۔

ڈاکٹر محمد افضال بٹ

انچارج فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ۔

حفیظ تائب کی نعت کے تخلیقی زاویے

Dr. Shagufta Firdous
Assistant Professor /Director Student Affairs GC Women University, Sialkot.
Dr. Muhammad Afzal Butt
Incharge Faculty of Arts &Social Sciences GC Women University, Sialkot.

Creative Aspects of Hafeez Taib's Naat

ABSTRACT

Dr Shahida Sardar is a renowned poetess of Khyber Pakhtunkhwa. Hafeez Taib is renowned Naat writer. He has a unique natiya consciousness among modern poets. He described the Holy Prophet's(S.A.W) love in various poetry genres like Ghazal , Free verse , sonnet Qatta, Rubai and special form of Alkosaria, . Which includes the ideal aspects of the Prophet's biography, contemporary issues, prayer style, Adorned with sincerity, devotion and the aspect of hope.This article will present thematic dimensions and creative aspects of his poetry.

Keywords: *Naat, biography, contemporary issues, aspect of hope, intellectual parts. Creative aspects.*

آقائے محتشم ﷺ کی مدحت میں محبت و عقیدت کے پھول نچھاور کرنا ہر شاعر کی دلی تمنا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے محبت کا اظہار جس طرح قرآن کریم میں کیا گیا اور اُن کے اتباع کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا گیا، جن کے بارے میں کہا گیا کہ اللہ اور اُس کے فرشتے نبی پاک ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں اس لیے اے اہل ایمان تم بھی اُن

Received: 06th Aug, 2022 | Accepted: 20th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

پر درود و سلام بھیجو۔ اس سے تمام اہل اسلام پر نبی کا مقام و مرتبہ اور اُن کی فضیلت واضح ہوتی ہے۔ اس لیے شاعری میں نبی اکرم ﷺ سے محبت کے اظہار کے لیے نعت گوئی کی روایت ملتی ہے۔ جس کا آغاز خود آپ ﷺ کے عہدِ مبارک میں مدینہ منورہ میں داخلے کے وقت بچیوں کے پڑھے جانے والے خوش آمدیدی کلمات طلع البدر علینا سے ہوتا ہے۔ نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی، تعریف و توصیف بیان کرنے کے ہیں، نعتیہ مضامین کو متنوع ہئیتوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ نعت نگار اپنے فن کے اظہار کے لیے مثنوی، رباعی، قطعہ، مخمس و مسدس، غزل یا آزاد نظم گویا کسی بھی ہئیت کو اختیار کر سکتا ہے، نعت گوئی میں جمالیاتی قدروں کے ساتھ ساتھ حفظِ مراتب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، یہ ایک مشکل فن ہے کیوں کہ اس میں ذرا سی کوتاہی کی بھی گنجائش نہیں ہوتی اور تعظیم کا پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔ اس فن کا حق ادا کرنے کے لیے عشق رسول ﷺ سے سرشار ہونا اولین شرط ہے۔ عربی شاعری سے یہ روایت فارسی اور وہاں سے مسلم سلاطین کی ہندوستان آمد اور مستقل سکونت کے ساتھ ہی ایرانی اور عربی تہذیب و ثقافت کے اثرات کے تحت اُردو میں بھی وارد ہوئی۔ اُردو شاعری میں بھی مثنوی کی صنف میں سب سے پہلے نعت لکھی گئی اور بعد ازاں دواوین کا آغاز حمد و نعت سے کیا جانے لگا۔ یوں نعت نگاری نے ترقی کے مختلف مدارج طے کئے اور اسے غزل، قطعہ، مثنوی، مسدس، آزاد نظم وغیرہ کی مختلف ہئیتوں میں برتا گیا۔ فرمان فتح پوری نے نعتیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ

> "عربی فارسی اور اُردو زبانوں کا شاید ہی کوئی مسلمان شاعر ہوں جس نے نعت کی شکل میں حضور اکرمؐ ﷺ سے اپنی عقیدت کا اظہار اور انسانی زندگی پر ان کے احسانات کا اعتراف نہ کیا ہو یہ الگ بات ہے کہ نعتوں کا جتنا بڑا اور قیمتی ذخیرہ عربی فارسی اور اُردو میں موجود ہے کسی دوسری زبان میں نظر نہیں آتا ہے۔"(۱)

اس ذخیرے میں مسلسل اضافے کے لیے اُردو نعت کی روایت میں بڑے بڑے نام ملتے ہیں جنہوں نے اپنے زور قلم کو نبی اکرم ﷺ کی شان بیان کرنے کے لیے وقف کیا۔ اُن میں سے ایک نام حفیظ تائب کا ہے جنہوں نے ابتدا تو غزل نگاری سے کی لیکن نعت لکھنے کے بعد ایسا مزا آیا کہ اپنے قلم کو اس کام کے لیے خاص کر دیا۔ وہ ۱۴ فروری ۱۹۱۳ء میں احمد نگر میں پیدا ہوئے، انہیں اس بات پر ناز تھا کہ وہ اس قصبے سے تعلق رکھتے ہیں جس کا نام ہی احمدِ مجتبیٰ ﷺ کے نام سے منسوب ہے اس کا اظہار انہوں نے کچھ یوں کیا ہے:

خوش ہوں کہ میری خاک احمد نگر کی ہے
مجھ پر نظر ازل سے شہِ بحر و بر کی ہے(۲)

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ عالی صفات سے محبت اور عقیدت کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور مختلف اصناف شعر میں نعت لکھی۔ ان کی نعتیہ شاعری پر مشتمل مجموعوں میں "صلوعلیہ وآلہ" اور "وسلمو تسلیما" بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ حفیظ تائب کو نعت نگاری کی صنف سے والہانہ پن کی حد تک وابستگی ہوئی حتیٰ کہ انہوں نے اس کو تاحیات اپنائے رکھا اور وہ اِسی نسبت کو اپنی بخت رسائی اور اوّلیں حوالہ کہا۔ اُنہیں اپنے دور کا اہم اور منفرد نعت گو ہونے کا اعزاز حاصل رہا، اُن کے کلام اور بیان میں حُبِّ رسول ﷺ کی شیفتگی اور حرمتِ رسول ﷺ سے وابستگی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ریاض مجید نے اُن کی نعت نگاری کے حوالے سے کہا کہ "نعت کے موضوع سے حفیظ تائب کی تخلیقی وابستگی کے اثرات ان کے طرز اظہار میں نمایاں ہیں، سبک الفاظ کا انتخاب، مترنم بحور، جذبے کا رچاو، جو اس دور کے نعت گو شاعروں کے نمایاں اوصاف ہیں، تائب کے فن میں اپنی پوری دلآویزیوں کے ساتھ جھلکتے ہیں، اُن کے ساتھ جذب و کیف اور اخلاص و گداز کے جوہر نے انہیں معاصر نعت نگاروں کی صف میں ممتاز و منفرد حیثیت عطا کی ہے۔"[۳] حفیظ تائب نے اس انفرادیت کو ہمیشہ برقرار رکھنے کی ایک شعوری کاوش بھی کی اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے اُن کی نعت کو روایت سے ہٹ کر عقیدت کا اظہار کہا ہے، جس میں محض سراپا نگاری نہیں کی گئی اور نہ ہی اُن کی نعت نگاری روایت کے تتبع میں صرف حصولِ ثواب کی خاطر ہے بلکہ اُنہوں نے اِس صنف کو تخلیقی سطح پر رفعت عطا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں نبی محتشم کے اوصاف حمیدہ کو قاری کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ لیکن اس میں عاجزی اور انکساری کے پہلو کو نمایاں رکھا ہے:

کہاں زبانِ سُخن ور، کہاں ثنائے حبیب
اُمید وارِ عنایت ہے نغمہ زائے حبیب[۴]

اُن کے موضوعاتِ شعری کا جائزہ لیں تو سراپائے رسول ﷺ کے بیان کے ساتھ سیرتِ رسول ﷺ کا بیان ملتا ہے۔ پیکرِ خلقِ عظیم، قامتِ رعنا کے مالک، حسنِ کُل جہاں، مہرِ منیر، وجہ تخلیق کائنات کے اوصافِ حمیدہ کا بیان ہو تو الفاظ بھی کم پڑ جاتے ہیں۔ حفیظ تائب نے آپ کے انہیں اوصاف ﷺ کو بیان کرنے کے لیے اُنہیں گُلِ چیدہ کہا ہے جس سے دو عالم مہک رہے ہیں اور کہیں آپ رسالتمآب ﷺ کی سیرت مطہرہ کو نور کہا، اُن کے رعنائی کردار اور زیبائی افکار کا کوئی ثانی نہیں۔ اُن کی سیرت چمنستانِ حیات کی ضیا اور حسن کا موّاج سمندر ہے۔ یہ سب حفیظ کے حُسنِ کلام کا جوہر ہے کہ اُس ہستی پاک کی شخصیت اور سیرت و کردار کے کئی پہلو قاری کے چشمِ تصور میں سما جاتے ہیں۔ جس میں قرآن کریم کی تفسیر کا پہلو بھی نمایاں ہے اور ہر کمزور کے لیے دستِ مددگار بھی اُن ہی کی ہستی میں میسر آتا ہے۔ اُن ہی کی ذات نے جہان کو تہذیب کی اُس روش پر ڈالا جہاں اُن سے بڑا مصلح کوئی نہیں ملتا:

یاد ہے بات مجھے حضرتِ صدیقہ کی
آپ کا خُلق بھی قرآن ہے سبحان اللہ (۵)

سیرت ہے تری جوہرِ آئینہ تہذیب
روشن ترے جلووں سے ہے جہانِ دل و دیدہ (۶)

ہر بندہ نادار کی قوّت تری رحمت
ہر رہرو درماندہ کی رہبر تری سیرت (۷)

سیرتِ پُرنُور تائب ہم کو دیتی ہے سبق
ہر قدم پر احترامِ آدمیت شرط ہے (۸)

حفیظ تائب کی شاعری کا مطمحِ نظر اُسوہ حسنہ پر عمل کر کے دنیا میں سرخروئی حاصل کرنا ہے وہ انہیں کو کامل ترین ہستی سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے دور کے مصائب سے نجات کے لئے آپ ﷺ کو مثالی کردار کے طور پر پیش کیا۔ اُنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کو وہ ہادی برحق کہا ہے:

جادہ عشقِ محمدِ پر رواں رہتے ہیں جو
وہ مسافر منزل مقصود پاتے ہیں ضرور (۹)

حفیظ تائب نے جدید نعت نگاری میں اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انہوں نے نعت کو سراپا نگاری تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اور انسانیت کی معراج کے لیے دیے جانے والے وہ زریں اصول متعارف کرائے جس سے اہل دنیا آشنا نہ تھے، اُنہوں نے اپنی نعت کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے بیان اور آپ ﷺ کے نظامِ مساوات کو متعارف کرایا جس کے تحت حسب و نسب کے تمام تفاخر کا خاتمہ کر کے اعمال صالح کو معیارِ فضیلت قرار دیا گیا۔ اُنہوں نے نبی اکرم کی ذاتِ گرامی کو صفا کا مہرِ منیر اور نورِ ضمیر بھی کہا اور شافع اُمتاں کے طور پر پوری دنیا کے لیے ایک محبوب ہستی کے طور پر پیش کیا جس نے انسانوں کو انسانیت کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا، آپ ﷺ کے اِسی وصفِ خاص کی تعریف میں حفیظ کہتے ہیں:

شہ دیں کے فکر و نگاہ سے مٹے نسل و رنگ کے تفرقے
نہ رہا تفاخرِ منصبی، نہ رعونتِ نسبی رہی (۱۰)

سی حرفی پنجابی شاعری کی مشہور صنف ہے حفیظ تائب نے اس میں بھی طبع آزمائی کرتے ہوئے رسول اکرم کے اوصاف حمیدہ اور ہستی پر نور کو خراج تحسین پیش کیا اور آپ کو رہبر عالم قرار دیا۔ انہوں نے حقیقی ثناخوان مصطفیٰ کے طور پر بکثرت آپ ﷺ کے اوصاف کو بیان کیا ہے۔

آپ ہیں جوہر حیات،

نورِ نگاہِ کائنات

پیکرِ جرات و ثبات،

موجبِ راحت و نجات

فکر و نظر کا منتہا

صلی علی نبینا صلی علی محمد (۱۱)

حفیظ تائب کی نبی اکرم ﷺ سے عقیدت و ارادت وفور جذبات میں ظاہر ہوتی ہے وہ اُن سے محبت کی اگلی منزلوں جہاں پر عشق کی راہیں متعین ہوتی ہیں جا ملتے ہیں لیکن اس میں بھی احترام کا پہلو ہمیشہ پیشِ نظر رہتا ہے اور اُن کے پیرایہ اظہار میں نیا پن پیدا ہوتا ہے۔

تج کے بے روح مشاغل اے دل

چھیڑ حضرت کے شمائل اے دل (۱۲)

اُن کی نعتیں عشق رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئیں ۔ وہ کائنات کی بھلائی اور اور انسانوں کی فلاح کے لیے اُسوہ رسول ﷺ کو بہترین نمونے کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے رسول پاک ﷺ کی حیات افروز تعلیمات سے اپنی نعتوں کو مزین کیا ہے اور آپ ﷺ کی ذات سے وابستہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کو واضح کیا جس سے لوگوں کے لیے رہبری اور رہنمائی کے نئے در کھلتے ہیں۔ اس حوالے سے احمد ندیم قاسمی "وسلموا تسلیما" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"انہوں نے آنحضرت ﷺ کے وجود گرامی سے شدید عشق کے علاوہ ان کی زندگی بخش اور زندگی افروز تعلیمات کو اپنی نعتوں کا موضوع بنایا ہے۔ اور یوں صنفِ نعت کی حدود کو آفاق کی حد تک پھیلایا ہے۔ اس پھیلاو نے نعت کے موضوع اور اظہار کو جو وسعتیں عطا کی ہیں ان کی جھلک اردو نعت میں اس سے ذرا پہلے کم کم ہی دکھائی دیتی تھی۔ (۱۳)

دلوں کی تہہ میں پوشیدہ محبت دیکھنے والا

وہ محبوبِ خدا جذبوں کی وسعت دیکھنے والا

وہی ہے سُننے والا اَن کہے الفاظ چاہت کے

وہی ہے اَن لکھے حرفِ اِرادت دیکھنے والا[۱۴]

حُسنِ محبوبِ خدا میں گُم ہوں

ایک پُرنور فضا میں گُم ہوں

اُن کے سانسوں کی مہک اور مرے اشک

جانفزا آب وہوا میں گُم ہوں[۱۵]

حفیظ تائب کی نعتوں میں عصری مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ سیرتِ خیر الوریٰ ﷺ کی روشنی میں وہ اُمت کے مسائل کا حل ڈھونڈنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اپنی نعتوں میں نبی اکرم ﷺ کے سامنے اپنے دل کی ہر کیفیت کو کھول کر بیان کیا ہے۔ اُنہیں اِس بات کا بھی احساس تھا کہ اُمت کی بے عملی نے اُنہیں دنیا میں خوار کر دیا ہے اور دین سے دوری انہیں عزت و وقار کے اعزاز سے محرومی کا باعث ہے، اس لیے کبھی رنجیدہ خاطر ہو کر التجا کرتے ہیں اور کبھی اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے وہ مدد کے تمنائی نظر آتے ہیں:

مدد مدد کہ کمر ٹوٹنے کو ہے میری

غمِ جہاں کا ہے وہ بار اے شہ ابرار[۱۶]

حفیظ کہیں پر تو دل کا حال اپنے نبی کی بارگاہ میں بیان کر کے مدد طلب کرتے ہیں تو کہیں اپنی قوم کو سنتِ نبوی کے مطابق صبر و استقامت سے مشکلات کا سامنا کرنے کو کہتے ہیں کہ یہ نبیوں کا شیوہ ہے:

یلغارِ غم جاں ہی تو رکھو یہ ذہن میں

جُورِ زمانہ سہنا ہے سُنت رسول کی[۱۷]

کبھی اُن کے دل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اضطراب میں مبتلا ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ نہ جانے اُن کی سب دعاوں کی قبولیت کی راہ میں کون سی دیوار حائل ہے جو اُن کی قوم کی مشکلات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں:

جانے کیا احوالِ امّت کے بدلنے میں ہے دیر
جانے کیا حائل دُعا کے پُر اثر ہونے میں ہے[۱۸]

حفیظ تائب جب اپنے اہل وطن کو ظلم وستم، فرقہ واریت، غم واندوہ کا شکار دیکھتے ہیں تو ان کی افسردگی کم کر کے انہیں حوصلہ مندی سے اللہ پاک کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینے کا پیغام ملتا ہے۔ انہوں نے ان سب کو فرقہ پرستی کی راہ سے اجتناب برتتے ہوئے اتحاد کی راہ دکھائی کے اسی سے مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ وہ انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر آج خزاں ہے تو کل بہار بھی ضرور آئے گی احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ اگر آپ حفیظ تائب کی نعتوں کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو گی کہ حضور ﷺ کے توسط سے وہ کائناتِ انسانی کے مثبت مطالعہ میں مصروف ہے۔ زندگی کا مسئلہ اس کے موضوع سے خارج نہیں ہے کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ اس کائنات کی تخلیق ہی اس وجود گرامی کی خاطر ہوئی جو ختم المرسلین بھی تھا اور خاتم النبیّن ﷺ بھی اور جس کا پیغام صرف عرب یا صرف عجم کے لیے نہیں تھا بلکہ پورے کرہ ارض کے علاوہ پوری کائنات کے لئے تھا۔[۱۹] حفیظ کی ملکی و ملی جذبات و احساسات کے تحت تحریر کردہ نعتوں سے اس صنف میں مزید وسعت پیدا ہوئی، انہوں نے اس کا دائرہ صفات احمدِ مجتبیٰ کے بیان سے بڑھا کر عصری مسائل کے بیان کی جانب بھی موڑا اور اس کے مضامین کو مزید تنوع عطا کیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ریاض مجید نے کہا کہ: تائب نے معاصر مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل و اقدار کو جزوِ نعت بنا کر وقیع و وسیع کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا فنِ نعت غیر نعت گو شعرا کے نزدیک بھی مقبول و پسندیدہ ہے۔"۔[۲۰] حفیظ تائب کا ایک شعری مجموعہ "مناقب" کے نام سے بھی شائع ہوا جس میں نعتوں کے ساتھ مناقب بھی موجود ہیں جو اُن کی نعت ہی کی ایک وسعت پذیر صورت ہے، انہوں نے اس میں اکابرین و مشاہیر اسلام کی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ اس میں حفیظ تائب نے اُمہات المومنین کے خُلق اور مروّت کے ساتھ اُن کی عنایات کے ساتھ اولیا و صوفیائے کرام کا بھی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی نعتوں کو اتحادِ امتِ مسلمہ کے لیے بھی استعمال کیا، اُن کی آرزو تھی کہ اسلام کا پرچم دنیا بھر میں سربلند ہو اور اُمتِ مسلمہ ایک بار اپنا گم کردہ پھر عزت و وقار حاصل کر لیں۔ اُن کی نظم "طلوعِ فجر" میں بھی اُن کی یہی تمنا جھلکتی ہے اور وہ اپنی قوم کو یہ مژدہ سناتے ہیں کہ:

بارک اللہ صبحِ تابندہ عیاں ہونے کو ہے
مطلعِ اسلام پھر نغمہ فشاں ہونے کو ہے
کان میرے سُن رہے ہیں فجر کی دلکش اذاں
ظلمتِ شب جلد اب وہم و گماں ہونے کو ہے

ملک و نسل و رنگ کے سب ساحلوں کو توڑ کر
قلزمِ دینِ محمد بیکراں ہونے کو ہے[۲۱]

اُن کی نعتوں میں استغاثہ کا رنگ بھی ملتا ہے جس میں وہ اپنی قوم کے غم و آلام کا نجات دہندہ نبی اکرم ﷺ کو کہتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی قوم کی موجودہ حالت کی سچی تصاویر پیش کرنے کی کوشش کی، جہاں وہ عاجزی اور ابتری کی اُس کیفیت کا شکار ہیں جہاں اُن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ دنیا پر حکمرانی کرنے والی قوم اب مجبور اور مقہور ہے، اُس کے لیے دنیا میں کہیں جائے پناہ نہیں، اُس کے دشمن مشرق و مغرب میں اندر اور باہر ہر سمت میں اُس پر حملہ آور ہیں، ایسے میں دل سے صرف ایک ہی ہستی کے سامنے اپنے دل کے درد کو بیان کرنے کا حوصلہ ملتا ہے وہ نبی رحمت ﷺ ہیں جو اپنی اُمت کی اس کیفیت پر رنجیدہ ہوں گے اُن کے سامنے اپنے دل کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے نویدِ مسیحا تری قوم کا حال عیسیٰ کی بھیڑوں سے ابتر ہوا
اس کے کمزور اور بے ہنر ہاتھ سے چھین لی چرخ نے برتری یا نبی
دشمنِ جاں ہوا میرا اپنا لہو میرے اندر عدو میرے باہر عدو
ماجرائے تحیّر ہے پُرسیدنی، صورتحال ہے دیدنی یا نبی[۲۲]

حفیظ تائب کی شاعری کا ایک خاص رنگ امید کا ہے ڈاکٹر انور سدید اُن کی شاعری میں ۔"اہم بات یہ ہے کہ ان کی عقیدت نے التجا اور تمنا کی صورت اختیار کی ان کی نعت حقیقت محمدی ﷺ کی تبلیغ کا وسیلہ بھی بن گئی۔ حفیظ تائب نے اس زمانے میں جنم لیا جب دہر کے اندھیرے دین کے اجالوں کو مدھم کرتے جا رہے تھے لیکن انہوں نے اندھیروں سے منہ موڑ کر اجالوں کو قبول کر لیا تھا۔[۲۳] ۔ اسی اُجالے کی مدد سے نہوں نے اپنے ماحول کی تیرگی کو ختم کرنے کی کوشش کی اور کرب کی کیفیت کے باوجود اُن کے دل میں اُمید کی شمع جگمگاتی رہی کہ ایک وقت ضرور آئے گا جب اُمت کی یہ مشکل گھڑی ٹل جائے گی اور اُس کی گم کردہ توقیر اُسے اپنے نیک عمل سے واپس ملے گی، اس حالت کو انتہائی پُر سوز انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

زیست کے تپتے صحرا پہ شاہِ عرب، تیرے اکرام کا ابر برسے گا کب
کب ہری ہو گی شاخِ تمنا مری، کب مٹے گی مری تشنگی یا نبی
یا نبی اب تو آشوبِ حالات نے تیری یادوں کے چہرے بھی دھندلا دیے
دیکھ لے ترے تائب کی نغمہ گری بنتی جاتی ہے نوحہ گری یا نبی[۲۴]

جب اندھیروں میں بھٹکنے کو تھی تائب زندگی

سیرتِ خیر الوری کی روشنی کام آگئی (۲۵)

وہ شافع محشر ﷺ سے اُس لمحے مدد کی اُمید رکھتے ہیں جس دن کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا، اُس دن سب کی پُرسانِ حال ایک ہستی ہوگی جو نبی اکرم ﷺ کی ہے۔ اس لیے حفیظ تائب کی نعت میں کشتِ آرزو کی آبیاری کے لیے سرچشمہ بھی اُسی ذات سے پھوٹتا ہے اور اُسی کی تجلیات اُن کی شاعری میں منعکس ہوتی ہیں۔

مجھ سیہ کار کو دیتے ہیں شفاعت کی نوید

شاہِ ابرا کی شب رنگ عبا کے جلوے (۲۶)

عقبیٰ کی منزلوں میں بھی ہوگا وہ دستگیر

آسان جس کے فیض سے کارِ جہاں ہوا (۲۷)

اُسی ذات کو وہ عزت و توقیر انسانی کا منبع بھی کہتے ہیں جن کا ذکرِ جمیل مشام جاں کو ہمیشہ معطر کرتا ہے، اور اُسی کی تعریف کو حفیظ تائب نے اپنی شاعری کا محور بنایا:

مری تسکیں، مری بخشش، مری توقیر کے ضامن

محمد ہی محمد ہیں برملا کہیے، بجا کہیے (۲۸)

حفیظ تائب کی نعتوں میں متنوع جہات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری لکھتے ہیں:

"اُن کی نعتوں میں حسن و جمال بھی ہے، فضائل و شمائل بھی ہیں۔ معجزات بھی ہیں، سیرت و کردار کا بیان بھی ہے، عصری شعور بھی، ذاتی اور اجتماعی ہے حوالے سے حضور کی بارگاہ میں استغاثہ و استمداد کی لے بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دلوں میں عشقِ رسول کی شمع روشن کرنے کی قوت و تاثیر بھی اُن کی نعتوں کی امتیازی خوبی ہے۔" (۲۹)

وہ اپنی آزاد نظم "زریں اُفق" میں نبی کریم ﷺ کو دائمی بہار قرار دیتے ہیں۔ جس کے خوش رنگ پھول اس کائنات کو مہکائے ہوئے ہیں، اُسی سے اُمید کی سبھی تاریں جڑی ہیں۔ وہ اس نظم میں کہتے ہیں:

وہ زرّیں افق آستانِ نبی ہے

جہاں رفعتیں سر جھکائے ہوئے ہیں

جہاں فصل گل کا تبسم سمٹ کر امر ہو گیا ہے[۳۰]

نعت کے جہاں فکری پہلو بہت اہمیت کے حامل ہیں وہیں اُس کے فن کی نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے اُس کو بطریقِ احسن استعمال کرنا بھی ایک فن ہے۔ حفیظ تائب کی نعتیں فکری اور فنی دونوں اعتبار سے اعلیٰ درجے کی ہیں جس میں اُن کے وفورِ جذبات اور محبت میں وارفتگی کا پہلو نمایاں ہے۔ حفیظ تائب کی نعتوں کا ایک حُسن اس میں استعمال ہونے والے مترنم الفاظ اور بحور بھی ہیں، جس سے اُن کے اسلوب کا جمالیاتی وصف، سامنے آتا ہے۔ انہوں نے اپنی نعت نگاری میں تمام شعری اوصاف کو بروئے کار لا کر نعت کو ایک نئی پہچان عطا کی۔

کھلا بابِ حرم الحمدِ للہ
کرم ہے دمبدم الحمدِ للہ
پیامِ راحتِ دارین لائے
کرم ہے دم بدم الحمدِ للہ[۳۱]

عارف عبدالمتین نے کہا تھا کہ جدید نعت نے روایتی نعت کو اس کی مذکورہ تحدید سے آزاد کر کے ایک مجتہد دانہ اقدام کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تبدیلی نے جدید نعت گو شعرا میں اپنی نعت کو محض جذبات و احساسات کے بیان سے اوپر اُٹھا کر فنّی سطح پر اِس کی وسعت اور وقعت میں اضافے کی ایک بھرپور کوشش کی ہے۔ یوں تخلیقی سطح پر اردو نعت نگاری کے میدان میں بہت تنوع پیدا ہوا اور شعرا نے اُسے سماجی مسائل کے بیان کے لیے بھی استعمال کیا۔

> "جدید نعت جہاں آنحضور ﷺ سے جذباتی اور احساساتی تحرک کا فیضان حاصل کر کے اپنی فنّی سطح کو ارفع تر بناتی ہے اور اس کی تخلیقی گرفت کو مضبوط تر بناتی ہے وہاں آنحضور ﷺ کی سیرت کے پیکرِ زریں سے اکتسابِ نور کرتی ہے اور ان کے کردار کے گوناگوں اوصاف حمیدہ سے عمرانی حوالے سے ان کے افعال و اعمال کی نوعیت و وقعت کا ادراک کر کے آشوبِ ذات اور آشوبِ کائنات پر قابو پانے اور ان کا مؤثر سدِّباب کرنے کے طریقے نہ صرف خود سوچتی ہے بلکہ دوسروں کو بھی سمجھاتی ہے۔ اور یوں وہ انفرادی و اجتماعی ہر دو سطح پر فروغ اور ارتقاء کی راہیں کھول کر شخصی، قومی، ملّی اور بالآخر انسانی نشوونما کے امکانات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے میں گراں قدر معاونت کرتی ہے[۳۲]

حفیظ تائب نے بھی جدید نعت کے ان سنہری اصولوں سے فیض یاب ہو کر اپنے فن کو انسانیت کی ترفیع و تجلیل کے لیے استعمال کیا اور اپنے عہد کی ترجمانی کی۔ انہوں نے پاکستان میں سیاسی خلفشار سے لے کر امت مسلمہ کی زبوں حالی مذہبی اور اخلاقی قدروں کی پامالی اور عالم اسلام کو درپیش مسائل کے بیان کے لئے بھی اپنی شاعری کو استعمال کیا حفیظ تائب کا شمار جدید نعت گُو شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اس صنف میں نیا پن پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اس لیے موجودہ عہد کو بھی حفیظ تائب کا عہد کہنا بے جا نہیں کیوں کہ اُنہوں نے نعت گوئی کی جس روش کو اپنایا آج بھی اس کا تتبع کیا جارہا ہے۔

حوالہ جات

۱-فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی نعتیہ شاعری، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۲۱

۲-حفیظ تائب، وسلمو تسلیما۔ القمر انٹر پرائزرز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔ ص ۹

۳-ریاض مجید، ڈاکٹر، اردو میں نعت گوئی۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء۔ ص ۵۱۲

۴-حفیظ تائب، کلیاتِ حفیظ تائب، القمر انٹر پرائزرز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔ ص ۱۵۲

۵-اَیضاً، ص ۱۲۴

۶-اَیضاً، ص ۱۱۹

۷۔ اَیضاً، ص ۱۲۸

۸۔ اَیضاً، ص ۴۳۰

۹۔ اَیضاً ، ص ۶۵۷

۱۰۔ اَیضاً، ص ۱۱۶

۱۱-حفیظ تائب۔ وسلمو تسلیما۔ ص۔ ۶۲

۱۲۔ کلیاتِ حفیظ۔ ۱۱۶

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی۔ دیباچہ۔ حفیظ تائب۔ وسلمو تسلیما، ص، ۱۱

۱۴۔ کلیاتِ حفیظ، ص ۱۳۰

۱۵۔ اَیضاً، ص۳۶۸

۱۶۔ حفیظ تائب، صلّوا علیہ وآلہ، لاہور: سیرت مشن پاکستان، ۱۹۷۸ء ص۷۷

۱۷۔ کلیات حفیظ تائب، ص۳۷۸

۱۸۔ اَیضاً، ص۴۴۴

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی۔ فلیپ، صلوعلیہ و آلہ، حفیظ تائب، ۱۹۷۶ء

۲۰۔ ریاض مجید، اردو میں نعت گوئی،، ص۵۱۲/۱۸۷

۲۱۔ حفیظ تائب، تعبیر، لاہور: القمر انٹر پرائزز، ۲۰۰۳ء ص۱۰۳-۱۰۴

۲۲-حفیظ تائب۔ صلّوا علیہ وآلہ۔ لاہور: سیرت مشن پاکستان۔ ۱۹۷۸ء ص۳۸

۲۳۔ ڈاکٹر انور سدید، بیسویں صدی کی اردو شاعری اور دوسرے مضامین، لاہور: مقبول اکیڈمی، سنہ ندارد، ص۳۶

۲۴۔ حفیظ تائب۔ صلّوا علیہ وآلہ، ص۳۹

۲۵۔ کلیاتِ حفیظ تائب، ص۴۵۲

۲۶۔ اَیضاً، ص۱۴۷

۲۷۔ اَیضاً، ص۱۶۷

۲۸۔ اَیضاً، ص۱۵۴

۲۹۔ محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر، حفیظ تائب اور اُن کی نعت گوئی—ایک تاثر "مشمولہ مدحت (نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ، خصوصی شمارہ نمبر ۳، اکتوبر تا مارچ، ۲۰۱۱ء ص۲۷۶

۳۰-کلیاتِ حفیظ تائب، ص۲۴۸

۳۱۔ اَیضاً، ص۱۲۵

۳۲۔ عارف عبد المتین، بے مثال ﷺ، حفیظ تائب،، ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۸۵ء، ص۱۵۷

References in Roman Script:

1. Farman Fateh Puri, Dr. Urdu ki Naatia Shairi, Aina-e-Adab,1974, Lahore. P.21
2. Hafeez Taib, Wasalimo Tasleema, Al-Qamar Enterprisers, 2004. P.9
3. Riaz Majeed, Dr., Urdu mein Naat Goi, Iqbal Academy Lahore, 1990, P.512.
4. Hafeez Taib, Kulyat-e-Hafeez Taib, Alqamar Enterprisers, Lahore,2005, P.152
5. Ibid, P.124
6. Ibid, P.119
7. Ibid, P.128
8. Ibid, P.430
9. Ibid, P.657
10. Ibid, P.116
11. Hafeez Taib, Wasal-e-mo-Tasleema, P.62.
12. Hafeez Taib, Kulyat-e-Hafeez Taib, P.116.
13. Ahmad Nadeem Qasmi, Preface, Wasal-e-mo-Tasleema, P.11.
14. Hafeez Taib, Kulyat-e-Hafeez Taib, P.130.
15. Ibid, P.368.
16. Hafeez Taib,Salo-Alaihi-Wa-Aalehi , Seerat Mission Pakistan, 1974, P.77
17. Hafeez Taib, Kulyat-e-Hafeez Taib , Page,378
18. Ibid, P.444
19. Ahmad Nadeem Qasmi,Salo-Alaihi-Wa-Aalehi , by Hafeez Taib ,Flap(P.N/A)
20. Riaz Majeed , Dr., Urdu mein Naat Goi,P.187
21. Hafeez Taib, Tabeer, Tabeer, Al-Qamar Enterprisers,2003,P.103-104
22. Ahmad Nadeem Qasmi, Wasal-e-mo-Tasleema, P.38.
23. Anwar Sadeed, Dr. Besveen Sadi ki Urdu Shairi or Dosry Mazameen.Maqbool Academy, Lahore, P.36
24. Hafeez Taib, Salo-Alaihi-Wa-Aalehi, P.39
25. Hafeez Taib, Kulyat-e-Hafeez Taib, P.452

26. Ibid, P.147
27. Ibid, P.167
28. Ibid, P.154
29. Muhammad Fakhr-ul Haq Noori, Dr. “Hafeez Taib oar un ki naat goi. Aik Tasur”Midhat, Special edition March- October 2011.P.276
30. Hafeez Taib, Kulyat-e-Hafeez Taib, P.258
31. Ibid, P.125.
32. Arif Abdul Mateen, Bemisaal. Karwan-e-Adab, Multan, 1985. P.157-156.

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.278

عبید اللہ

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد ارشد اویسی

صدر شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور۔

اقبال اور رومی کا تعلق ڈاکٹر ملک حسن اختر کی نظر میں

Ubaid Ullah
PhD Scholar, Department of Urdu, Lahore Garisson University, Lahore.
Professor Dr. Mohammad Arshad Ovaisi
Head Department of Urdu, Lahore Garisson University, Lahore.

Relationship of Iqbal and Rumi in the eyes of Dr.Malik Hassan Akhtar

ABSTRACT

Dr. Malik Hassan Akhtar is a renowned researcher and a critic of Urdu literature. His voluminous work has been recognized in Pakistan and across the border as a valuable contribution especially in the field of Iqbaliat. He has worked on intellectual and spiritual inspiration of Iqbal from various Muslim scholars and Sufis including Imam Malik, Hallaj, Ibne Arbi, Usman Hajvery, Aljeli, Rumi and others. But he is spiritually inspired from Rumi most of all. Dr. Malik Hassan Akhtar has produced a detailed and in-depth treatise on this topic while meeting the international standards of research.

Keywords: *Contribution, spiritually, inspired, Sufis, extension, international, work, treatise, valuable, voluminous.*

اقبال اور رومی ملک حسن اختر کی نظر میں

ڈاکٹر ملک حسن اختر ایک معروف محقق اور نقاد ہونے کے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی حلقوں میں ایک ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے مولانا روم اور علامہ اقبال کے روحانی اور فکری تعلق پر قابلِ

Received: 03rd Aug, 2022 | Accepted: 17th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

قدر کام کیا ہے۔ ان کی رائے میں یہ تعلق ٹھوس اور تاریخی نوعیت کی وجوہات اور منطقی بنیادوں پر قائم ہے۔ ملک حسن اختر ان بنیادوں کو بڑی مہارت اور جانفشانی سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم بنیاد یہ ہے کہ دونوں زعما حرکت و عمل کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں بجا طور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر جس طرح کا تصوف کا تصور عوام کے ہاں مقبول و معروف ہے اس کی راہیں حرکت و عمل سے تہی ہیں اور بے عملی اور ترکِ دنیا پر مائل کرتی ہیں۔ لیکن مولانا ایک ایسے متصوف تھے جو حرکت و عمل کے قائل تھے۔

ملک حسن اختر کا یہ مضمون ان کی کتاب "اقبال اور مسلم مفکرین" میں شامل ہے۔ یہ کتاب، فیروز سنز لاہور کی جانب سے ۱۹۹۲ میں شائع ہوئی۔ اس میں مسلمان فلاسفہ و اہل تصوف کے ساتھ اقبال کا فکری تعلق ظاہر کیا گیا ہے اور موازنہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ایک مضمون اقبال اور رومی کے نام سے بھی موجود ہے جس میں ان شخصیات کے فکری و روحانی تعلق کا تجزیہ ملک حسن اختر نے اپنے انداز میں کیا ہے۔ (۱)

ملک حسن اختر نے فکرِ اقبال کے ان پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے جن میں وہ رومی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ملک حسن اختر کی رائے میں بے عملی اور جمود کا جو الزام عموماً اہل صفا پر لگایا جاتا ہے، مولانا روم متصوف ہونے کے باوصف، اس الزام سے بری الذمہ ہیں۔ یہ ایک کمیاب مثال ہے۔ اس سلسلے میں ملک حسن اختر نے اقبال کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں جو انھوں نے رومی کے حرکت و عمل کے درس کے ضمن میں کہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال مولانا روم کو حرکت و عمل کا داعی سمجھتے تھے:

پیرِ رومی رفیقِ راہ ساز
تا خدا بخشدت تراسوز و گداز
جذبہ ہائے تازہ اُو را دادہ اند
بندہائے کہنہ را بکشادہ اند (۲)

لیکن حرکت و عمل کے عنوان کے تحت بلاواسطہ اور واضح طور پر ملک صاحب نے اس مضمون میں تجزیہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ایک اہم موضوع ہے جو کہ ان دونوں زعما کے درمیان مشترک ہے۔ راقم کی تحقیق کے مطابق یہ اہم ترین موضوع ہے جس نے اقبال کو مولانا روم کی طرف مائل کیا ورنہ مولانا بھی ایک صوفی ہیں اور متعدد نمایاں شارحین اور ادبا کی نظر میں ہمہ اوست کے بھی قائل ہیں۔ مختصراً یہ کہ ملک حسن اختر نے اس موضوع پر دونوں کی فکری ہم آہنگی کو بالواسطہ طور پر بیان کیا ہے اور مناسب اہمیت نہیں دی۔ اس سلسلہ میں قاضی سجاد حسین نے مثنوی مولانا روم سے حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اسباب کا اختیار کرنا اور زندگی کی جدوجہد میں صبر و استقلال کے ساتھ زندگی کے نشیب و فراز سے دوچار ہونا ہمیشہ سے خاصانِ خدا کا خاصہ رہا ہے"۔ (۳)

مثنوی سے یہ اشعار بھی لکھے ہیں۔

سعی ابرار و جہادِ مومناں
تا بدین ساعت زِ آغازِ جہاں
حق تعالیٰ جہدِ شاں راراست کرد
آنچہ دیدند از جفائے گرم و سرد

اقبال کا ایک معروف شعر ہے:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اس سلسلے میں مولانا روم کا یہ شعر معروف ہے:

بزیرِ کنگرہء کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر (۴)

القصہ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حرکت و عمل کے نظریہ کے ضمن میں اقبال سرچشمہء رومی سے فیض یاب ہوئے ہیں جو کہ رومی کے پیغام اور کلام کا اہم حصہ ہے۔

ایک اور اہم موضوع ہمہ اوست کے نظریہ پر دونوں شخصیات کے نقطۂ نظر کا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ علامہ اقبال ہمہ اوست یا وحدت الوجود کے نظریہ کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ اس کو امتوں کے لئے ضرر رساں سمجھتے تھے۔ لیکن مولانا روم ایک صوفی بزرگ تھے جو کہ ہمہ اوست کے نظریہ کے قائل تھے۔ کچھ لوگوں نے اس طرح کی تاویلات پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ رومی ہمہ اوست کو نہیں مانتے تھے۔ قاضی سجاد حسین نے مثنوی مولانا روم کے دیباچے میں رومی کے وجودی ہونے کا دفاع کرتے ہوئے تاویل پیش کی ہے کہ

"شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ پہلے وحدت الوجود کے معنیٰ سمجھ لو پھر حقیقتِ حال سمجھنا۔۔۔۔۔ سورج کی روشنی میں تمام ستارے چھپ جاتے ہیں تو دیکھنے والا صرف سورج کا وجود سمجھتا ہے اور ستاروں کو معدوم سمجھتا ہے حالانکہ وہ نفس الامر میں وجود اور منور ہوتے ہیں۔ تو یہ لوگ جس کو وحدت الوجود سمجھ گئے ہیں وہ وحدت الشہود ہے"(۵)

علامہ اقبال کے ایک معروف ممدوح حضرت مجدد الف ثانی وحدت الشہود کے اولین شارح سمجھے جاتے ہیں۔ قاضی سجاد حسین کے بقول اُن سے پہلے تمام "ہندوستانی صوفیا میں ایک ہی فلسفہ رائج تھا اور وہ تھا ابن العربی کا فلسفۂ وحدت الوجود"۔ (۶)

حضرت مجدد الف ثانی بھی اقبال کے ممدوح ہیں اور مولانا روم بھی۔ لیکن رومی سے اقبال کا تعلق پیر و مرید کا ہے۔ اس لئے یہ نکتہ اہم ہے کہ ہمہ اوست کے موضوع پر ہر دو شخصیات کے خیالات کیا ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے اقبال حضرت مجدد کے عقید تمند ہیں جو کہ وحدت الشہود کے قائل تھے اور انہوں نے ہمہ اوست کے نظریہ کے مضر اثرات سے مسلمانوں کو خبر دار کیا۔ ان کے بارے میں اقبال نے لکھا ہے کہ:

"وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبر دار"(۷)

دوسری طرف مولانا روم وجودی ہیں یعنی ہمہ اوست کے قائل۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ملک حسن اختر کا نظریہ واضح ہے کہ مولانا وحدت الوجود کو مانتے ہیں۔ ملک حسن اختر لکھتے ہیں کہ

"مولانا وحدت الوجود کے نظریے کے تحت چاہتے ہیں کہ قطرہ سمندر میں مل کر سمندر بن جائے"(۸)

اس سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ملک حسن اختر کے مطابق مولانا روم وحدت الوجود کے ماننے والے ہیں۔ ان کے اس مؤقف کی تائید دیگر زعمانے بھی کی ہے۔ چناچہ قاضی سجاد حسین نے مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

"مولانا بحر العلوم نے وحدت الوجود کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ صوفیا کے نزدیک "وجود سے مراد مصدری معنیٰ نہیں ہیں کیونکہ وہ خارج میں موجود نہیں"۔(۹) گویا معدوم ہیں۔

لیکن اقبال کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اشیا کو معدوم سمجھتے ہیں۔ ملک حسن اختر اس بات کے قائل ہیں کہ علامہ اقبال سمندر اور قطرہ والی مثال کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ سمندر اور موتی کی تشبیہ کو بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر حسن اختر کے الفاظ میں

"موتی اگرچہ سمندر سے پیدا ہوتا ہے مگر سمندر سے الگ اپنا وجود برقرار رکھتا ہے"۔(۱۰)

پیر و مرید میں یہ فکری اور نظریاتی بُعد بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضرورت اور تقاضائے حالات بھی نظریات کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ اور ضروری نہیں کہ ان نظریات میں معروضی حقیقت بھی

ہو۔ڈاکٹر حسن اختر نے دونوں کے اس اختلافی زاویہ نظر کی تاویل پیش کی ہے کہ اس کا سبب دونوں کے زمانے مختلف سیاسی حالات تھے۔[۱۱] یہاں معروضیت کی بجائے تقاضائے حالات کو دونوں کے نظریاتی اختلاف کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

وحدت الوجود کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ جس کا ذکر ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اپنی کتاب میں کیا ہے وہ جبر و قدر کے موضوع پر پیر و مرید کے خیالات میں اختلاف ہے۔جبر و قدر کی بحث اسلامی تصوف اور ادبیات میں بہت پرانی ہے۔ نظریہء جبر کے ماننے والوں کے نقطۂ نظر سے انسان مجبور محض ہے اور اپنے اعمال میں آزاد نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی رضا سے ہوتا ہے۔میر تقی میر کا معروف شعر ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اس نقطۂ نظر میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر انسان مجبورِ محض ہے تو پھر سزا و جزا کا حق دار کیسے ٹھہرا۔ دوسری طرف نظریہء قدر کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ انسان مجبورِ محض نہیں بلکہ اپنے اعمال و افعال میں مختار ہے۔اگرچہ یہ مختاری محدود ہے۔ اقبال بھی قدری ہیں۔تقدیر کے موضوع پر ان کے اشعار ان کے نظریہ کے عکاس ہیں۔لکھتے ہیں کہ:

خود عمل تیرا ہے صورت گر تری تقدیر کا
شکوہ کرنا ہے تو اپنا کر مقدر کا نہ کر
تقدیر کے پابند بناتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند[۱۲]

اس مسئلہ میں دونوں زعما کافی حد تک متفق ہیں۔ڈاکٹر حسن اختر نے اس مسئلہ کی وضاحت کی ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا روم وجودی ہونے کے باوجود اپنے اعمال پر انسان کے اختیار کے قائل تھے۔علامہ اقبال نے بال جبریل کی اپنی معروف نظم پیر و مرید میں عالم خواب میں مولانا روم سے اپنے مکالمہ کو منظوم کیا ہے۔اس میں دونوں کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے۔ حسن اختر کہتے ہیں کہ جب اقبال نے رُومی سے پوچھا کہ:

اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر
میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

تو اس کے جواب میں مولانا نے جواب دیا" انسان کو اختیار دیا گیا ہے اور وہ کہیں بھی مجبور نہیں ہے"۔[۱۳]

حقیقت یہ ہے کہ تقدیر پرستی کے عام مفہوم اور روایتی نقطہ نظر نے مسلمانوں کو من حیث القوم بہت نقصان پہنچایا۔ طرح طرح کی تاویلات نے جنم لیا بعض اسلامی عقائد کی تشریح اس طرح کی گئی کہ ابہام کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مثلاً ایک طرف تو انسان مکمل طور پر خدائے تعالیٰ کی مرضی کا تابع ہے اور وہ جسے جو چاہتا ہے وہ دیتا ہے تو دوسری طرف اعمال کے حساب اور جزا و سزا کا نظام بھی موجود ہے۔ اسلامی فکر میں اس مسئلہ پر کافی بحث ہوتی رہی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں معتزلہ سمجھتے تھے کہ انسان کے سامنے بے شمار راستے کھلے ہوتے ہیں اور وہ اپنی مرضی کا راستہ چننے میں آزاد ہے۔ معتزلہ کا کہنا تھا کہ نظریہء جبر کو مان لیا جائے تو" ذمہ داری، باز پرس، جزا و سزا وغیرہ کے تمام نظریات بے معنی ہو جائیں گے"۔[۱۴]

یہ ایک پریشان کن اور بظاہر لاینحل فکری مسئلہ تھا۔ اس سے مسلمانوں میں فکری انتشار پیدا ہوا جو کسی حد تک آج بھی موجود ہے۔ اس مسئلہ پر مفکرین کے ایک گروہ اشاعرہ نے درمیانی روش اختیار کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ انسان کسی چیز کو تخلیق تو نہیں کر سکتا لیکن اعمال کا اکتساب کر سکتا ہے۔ گویا آدھا مجبور اور آدھا مختار ہے۔ اس طرح اشاعرہ نے تخلیق اور اکتساب کے درمیان امتیاز ظاہر کر کے انسانی اختیار کی حدود کا تعین کیا"۔[۱۵]

مولانا روم کیونکہ نظریہء قدر کے حامی ہیں جیسا کہ علامہ اقبال تھے، اس لئے وہ منشائے الٰہی کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ جبر کی بجائے قدر کو فروغ دیتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ فلاں کام فلاں وزیر ہی کر سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بے عمل ہو کر بیٹھ جائیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس وزیر کو خوش کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کریں۔[۱۶] اس بحث سے ملک حسن اختر یہ ثابت کرتے ہیں کہ علامہ اقبال اور مولانا روم دونوں نظریہء جبر کی بجائے نظریہء قدر کے قائل ہیں اور علامہ اقبال کے مولانا روم کو مرشد بنا لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ تقدیر کے مسئلہ میں ان کے ہم خیال ہیں۔

دونوں اکابرین کا ایک اور اہم مشترک موضوع عشق ہے۔ دونوں ہی عشق کو انسان کی معراج قرار دیتے ہیں۔ لیکن تفصیلی تجزیے میں دونوں کے تصور عشق میں کچھ اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر کے رائے میں دونوں کے تصورِ عشق میں فرق کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے سیاسی حالات مختلف تھے۔ راقم جزوی طور پر ہی اس بات سے متفق ہے۔ دراصل ان ہر دو اکابرین کا اپنا اپنا ایک مبسوط اور مکمل فکری نظام ہے۔ ان میں کچھ مماثلتیں ہیں تو کچھ اختلافات بھی ہیں۔ جب کہ مولانا کے نزدیک دنیاوی علائق سے قطع تعلقی ہی عشق کی معراج تھی، علامہ اس

کو نفیٔ خودی سمجھتے تھے اور اس سبق کو اپنی محکوم اور غلام قوم کے حق میں ضرر رساں سمجھتے تھے۔ انہوں نے خلیفہ عبدالحکیم کا اس موضوع پر حوالہ دیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کا کہنا ہے کہ

"عشق مثنوی کا اہم ترین موضوع ہے۔ جو اس کے ہر دیگر مضمون پر چھایا ہوا ہے۔ مولانا ہزار طرح سے اس کی تفسیر کرتے ہیں اور وجد و مستی میں نغمہ ریز ہوتے ہیں"۔[۱۷]

یہاں اقبال اور رومی کے تصورِ عشق میں ایک اختلاف پایا جاتا ہے۔ اقبال انسانی عشق کو عشق کی ایک گھٹیا صورت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

دوسری طرف مولانا روم عشق مجازی سے حقیقی تک کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ابتدا پیشِ بُتاں افتادگی
انتہا از دلبراں آزادگی

یعنی عشق کی ابتدا انسانوں سے عشق سے ہوگی ہے اور انتہا یہ ہے کہ عاشق ان انسانی معشوقوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ باالفاظِ دیگر ذاتِ حق سے عشق کرنے لگتا ہے۔ اس سلسلہ میں معروف پنجابی شاعر میاں محمد بخش کا یہ مصرع مشہور ہے کہ:

عشق مجازی حق دا زینہ کہیا عارف لوکاں

لیکن علامہ اقبال اور رومی معروف معنوں میں عشقِ مجازی کے قائل نہیں۔ ڈاکٹر حسن اختر کہتے ہیں کہ علامہ اقبال اور مولانا روم ایسے عشق کے قائل ہیں جو

"انسانیت کی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ جو کمزور اور لاغر بنانے کی بجائے ہمت اور قوت عطا کرتا ہے"۔[۱۸]

مولانا روم کے الفاظ ہیں:

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد[۱۹]

درجِ بالا مضمون سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ملک حسن اختر کی نظر میں علامہ اقبال اور مولانا روم میں فکری مماثلت کے ساتھ ساتھ اختلافات بھی ہیں۔ مماثلتوں میں دونوں کا نظریہء جبر کی بجائے نظریہء قدر کا قائل

ہونا، جمود کی بجائے حرکت و عمل کا قائل ہونا، دونوں کا سرچشمہ ء فکر کلامِ الٰہی ہونا، اقوامِ عالم کے عروج و زوال کا موضوع، عشق کو عظیم انسانی صفت اور قوتِ محرکہ گردانا شامل ہیں۔ جب کہ اختلافی امور یہ ہیں کہ مولانا وحدت الوجود کے حق میں ہیں اور اس نظریہ کے بارے میں علامہ کی نسبت نرم رویہ رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا خودی کو مٹا کر ذاتِ حق سے واصل ہونا چاہتے ہیں۔ انہوں نے انسانی وجود کو نہر اور خدا کو دیوار سے تشبیہہ دی ہے اور کہا ہے کہ دیوار کو گرائے بغیر نہر تک پہنچنا ناممکن ہے۔ جب کہ علامہ تعمیرِ خودی پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حسن اختر ان اختلافی نکات کی وجہ دونوں شخصیات میں پائے زمانی بُعد اور معروضی حالات کے فرق کو قرار دیتے ہیں۔ رومی ایک آزاد مسلمان سلطنت کے باشندے تھے جب کہ اقبال غلام ہندوستان کے۔ حسن اختر کا مضمون فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، مضمون: اقبال اور رومی، مشمولہ: اقبال اور مسلم مفکرین، ڈاکٹر ملک حسن اختر، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۲، ص: ۱۳۲

۲۔ ایضاً، ص: ۱۴۷

۳۔ رومی، جلال الدین، مثنوئ مولوئ معنوی، مترجمہ: مولانا قاضی سجاد حسین، لاہور، حامد اینڈ کمپنی، ۱۹۷۴، ص: ۱۷

۴۔ ایضاً، ص: ۱۷

۵۔ ایضاً، ص: ۱۳

۶۔ ایضاً، ص: ۱۴

۷۔ محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعتِ دوم، ۲۰۱۵، ص: ۴۸۹

۸۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، مضمون: اقبال اور رومی، مشمولہ: اقبال اور مسلم مفکرین، ص: ۱۶۰

۹۔ رومی، جلال الدین، مثنوئ مولوئ معنوی، مترجمہ: مولانا قاضی سجاد حسین، دیباچہ، ص: ۱۲

۱۰۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، مضمون: اقبال اور رومی، مشمولہ: اقبال اور مسلم مفکرین، ص: ۱۶۱

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۶۱

۱۲۔ محمد اقبال، علامہ، ضربِ کلیم، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، ص:۵۷۷

۱۳۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، مضمون: اقبال اور رومی، مشمولہ: اقبال اور مسلم مفکرین، ص:۱۷۱

۱۴۔ عبدالخالق، ڈاکٹر، مسلم فلسفہ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۱۹۹۵، ص:۸۷

۱۵۔ ایضاً، ص:۸۷

۱۶۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، مضمون: اقبال اور رومی، ص:۱۷۲

۱۷۔ عبدالحکیم، خلیفہ، حکمتِ رومی، لاہور، ادارہء ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۵۵، ص:۲۳

۱۸۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، مضمون: اقبال اور رومی، ص:۱۶۳

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۶۳

References in Roman Script:

1. Malik, Hassan Akhatar, Dr,Mazmoon"Iqbal awr Rumi, Mashmoola Iqbal awr Muslim mufakkreen, Majommoa e Mazameen, , Feroz Sons, Lahore, 1992,P.132
2. Ibid, P.147
3. Rumi, Jalal ud Din, Masnavi Molvi Manvi, Mutarjuma: Molana Qazi Sajjad Hussain, Lahore, Hamid and Company, 1974, P.17
4. Ibid, P.17
5. Ibid, P.13
6. Ibid, P.14
7. Muhammad Iqbal, Allama, Bal e Jibril, Mashmoola: Kuliyat e Iqbal, Islamabad, National Book Foundation, Ishat e Dom, 2015, P. 489
8. Malk Hassan Akhtar, Dr, Mazmoon: Iqbal aur Rumi, Mashmoola: Iqbal or Muslim Mufakreen, P. 160
9. Rumi, Jalal udin, Masnavi Molvi Manvi, Mutarjama: Molana Qazi Sajjad Hussain, Dibacha, P.12
10. Malik Hassan Akhtar, Dr, Mazmoon: Iqbal or Rumi, Mashmoola: Iqbal or Muslim Mufakreen, P.161
11. Ibid, P.161

12. Muhammad Iqbal, Allama, Zarbe Kaleem, Mashmoola: Kuliyat e Iqbal, P. 577
13. Malik Hassan Akhtar, Dr, Mazmoon: Iqbal or Rumi, Mashmoola: Iqbal or Muslim Mufakreen, P.171
14. Abdul Khaliq, Dr, Muslim Falsafa, Lahore, Aziz Book Dipu, 1995, P. 78
15. Ibid, P.78
16. Malik Hassan Akhtar, Dr, Mazmoon: Iqbal or Rumi, P.172
17. Abdul Hakeem, Khalifa, Hikmat e Rumi, Lahore, Idara Siqafat e Islamia, 1955, P. 23
18. Malik Hassan Akhtar, Dr, Mazmoon: Iqbal or Rumi, P. 163
19. Ibid, P.163

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.279

راج محمد

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، قرطبہ یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، پشاور۔

ڈاکٹر تحسین بی بی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، قرطبہ یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، پشاور۔

پشاور ٹیلی وژن کے ڈرامے کے ارتقا میں یونس قیاسی کا کردار

Raj Muhammad
PhD Scholar, Department of Urdu, Qurtuba University of Science and Technology, Peshawar.
Dr.Tahseen Bibi
Associate Professor, Department of Urdu, Qurtuba University of Science and Technology, Peshawar.

Role of Younas Qayasi in Evolution of Drama on Peshawar Television

ABSTRACT

Drama is a literary genre of fiction .It has dated back as the human history itself. It passed through various cultural boundaries. In Hindustan, various dramatists exhibited their skills and potential in it. When partition of Pakistan took place, the dramatists of KPK, especially showed great contributions. One of among them, Younas Qayasi is well known dramatist, who presented and staged not only Urdu but Pashto and Hindko dramas too. He earned great fame and name at national and International level.

Keywords: *Indian, khyberpukhtunkhwa, independent, observation power, Younas Qiasi, feudalism, television.*

افسانوی ادب کی ایک اہم صنف "ڈراما" کا آغاز نسلِ انسانی کی تاریخ کے ساتھ ہی سے ہوا ہے۔ جو مختلف روپ میں نسل در نسل منتقل ہوتا گیا۔ پہلے پہل لوگ اپنے ارد گرد ہونے والے معاملات کا جائزہ ومشاہدہ کر کے ان سے کسی نہ کسی طور ابلاغ قائم کرتے۔ ڈراما اظہار وابلاغ کی مؤثر ترین صورت ہے جس میں مختلف حرکات وسکنات، نقالی

Received: 09th Aug, 2022 | Accepted: 05th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

اور بات چیت کے سہارے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔ڈرامے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مصر اور چین کے ساتھ ساتھ مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں یونان کو اس کی جنم بھومی تصور کیا جاتا ہے۔ڈرامے کی تاریخ کے متعلق ابراہیم یوسف لکھتے ہیں:

> ڈراما تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے اور جب تک انسان میں نقالی کا جذبہ موجود ہے ڈراما یا ناٹک بھی موجود رہے گا۔(۱)

ہندوستان میں اردو ڈراما اس وقت سامنے آیا جب افرا تفری اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔اس وقت ہندوستانی معاشرہ انحطاط پذیری کا شکار تھا۔ یہی انحطاط پذیری و کشمکش اردو ڈرامے کی بنیاد بنا اور بہت جلد ڈراما اس معاشرت و سماج کا حصہ بنا۔بقول ڈاکٹر محمد اسلم قریشی:

> اردو ڈراما یہاں کی معاشرت اور سماج کی مٹی سے پھوٹا ہے۔اس نے وہی روپ دھارا جو حالات کا تقاضا تھا۔وہی پیکر اختیار کیا جو عوامی رجحانات نے اس کے لیے تراشا تھا۔(۲)

اردو ڈرامے کے سفر کا آغاز واجد علی شاہ کے ڈراما "رادھا کنہیا" اور امانت لکھنوی کے ڈراما "اندر سبھا" سے ہوا جو مختلف فنی و فکری مراحل طے کرتا ہوا بیسویں صدی کے دورِ جدید میں داخل ہوا۔اردو ڈرامے کا جدید دور امتیاز علی تاج سے شروع ہوتا ہے۔ اردو ڈراما نگاروں نے اپنے تمام افکار و خیالات کو اپنے ڈراموں کے ذریعے عوام تک پہنچا کر فنِ ڈراما نگاری کو مقبولیت و شہرت سے ہمکنار کیا۔اردو ڈرامے کی ترقی کے حوالے سے ڈاکٹر اشرف کمال لکھتے ہیں:

> اردو ڈرامے نے شروع سے آج تک بہت ترقی کی ہے اور اس میں جدید ذریعہ ابلاغ کا بھی ہاتھ ہے جس نے اردو ڈرامے کی مقبولیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔(۳)

اردو ڈرامے کی ترتیج و ترقی میں ہندوستان کے تمام خطوں و علاقوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے اور اس صنف میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر اس کو پروان چڑھایا۔اسی طرح سے خیبر پختونخوا کے طبقہ علم و دانش نے دیگر شعبہ حیات کی طرح اردو ادب کی ترقی و ترویج میں اپنا بھرپور حصہ ڈالتے ہوئے اردو ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔جن میں اردو ڈراما بھی قابل ذکر ہے۔

ڈراما ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت خیبر پختونخوا کی تہذیب و تمدن اور یہاں کے معاشرے کی عدم دل چسپی کے سبب کافی دیر سے پہنچا۔اس کے ساتھ یہ بات بھی سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہندوستان کی دوسری اقوام کی نسبت پشتون قوم مذہب پرستی کی طرف زیادہ مائل تھی۔ پھر یہاں کے ادبا نے ابتدائی ڈراما کو

سنبھالا نہیں دیا۔ جس کی وجہ سے خیبر پختونخوا میں تھیٹر ڈراما زیادہ دیر تک پنپ نہ سکا۔

مشترکہ ہندوستان میں ۱۹۳۵ء کو ریڈیو اور خود مختار پاکستان میں ۱۹۶۴ء کو ٹیلی وژن کی آمد کے ساتھ نامور ادیبوں اور ڈراما نگاروں نے ڈرامے لکھنا شروع کیے۔ چند ڈراما نگار خیبر پختونخوا کی معاشرت کی ترجمانی کرتے ہوئے ایسے مقام تک پہنچ گئے جنہوں نے پاکستان اور باہر ممالک میں اپنی پہچان بنائی۔ ڈراما نگاری کے میدان میں ان کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان میں خاطر غزنوی، ڈاکٹر ڈینس آئزک، فضل حسین صمیمؔ، بشارت احمد، مشتاق شباب، نذیر بھٹی اور یونس قیاسی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

یونس قیاسی (۱۹۴۲ء– ۲۰۱۸ء) اپنی منفرد پہچان کی بدولت خیبر پختونخوا میں ڈرامے کے سرخیل ہیں۔ ان کو بیک وقت اردو، پشتو اور ہندکو کا کامیاب ڈراما نگار کہا جاتا ہے۔ یونس قیاسی ادب کی دنیا میں ایک کامیاب صحافی، ڈراما نگار، فلم نگار، کالم نگار، افسانہ نگار اور شاعر کے طور پر متعارف ہوئے ہیں۔ صوبہ خیبر پختونخوا میں ٹیلی وژن کے طبع زاد اردو ڈراما کی ترقی وارتقا میں یونس قیاسیؔ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اردو ڈرامے کے ساتھ ساتھ پشتو اور ہندکو زبان میں بھی کئی ڈرامے لکھے جن کو کافی شہرت ملی۔ بقول حبیب الرحمان:

> اردو، پشتو، ہندکو ڈراما نگاری کی دنیا کے معروف نام یونس قیاسیؔ نے ان تمام زبانوں اور تمام اصناف میں اس قدر کام کیا ہے اور اتنا دقیق کام کیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ وہ کس زبان کے بڑے ڈراما نگار ہیں۔ (۴)

یونس قیاسی کا اصل نام محمد یونس ہے۔ آپ نے سمندر خان سمندرؔ کی رائے پر عمل کر کے نثر نگاری شروع کی۔ افسانوں کے بعد جلد ہی آپ نے ڈراما نویسی کا آغاز ریڈیو کے لیے لکھے گئے ۱۵ منٹ کے پشتو ڈرامے "سپیرہ" سے کیا۔ اس کے بعد سٹیج اور ریڈیو کے لیے متعدد اردو ڈرامے تخلیق کیے۔ ۱۹۷۴ء میں پشاور میں ٹیلی وژن مرکز کے قیام کے بعد قیاسیؔ نے ٹی وی کے لیے متنوع موضوعات پر مبنی کئی مشہور اردو ڈرامے تحریر کیے۔

یونس قیاسی کے ڈراموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ڈرامے ہمارے معاشرے کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ ان ڈراموں میں ہمیں کوئی مصنوعی پن نظر نہیں آتا۔ موصوف نے کسی ایسے موضوع کا انتخاب نہیں کیا جس کا تعلق ہمارے معاشرے سے نہ ہو۔ ان کے ڈراموں کو دیکھنے سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف قیاسی کی قوتِ مشاہدہ غیر معمولی نوعیت کی ہے بلکہ وہ اس قوتِ مشاہدہ کو تجرباتِ زندگی کی چھلنی سے کشید کر کے اپنے فن سے اسے جلا بخشتے ہیں۔

یونس قیاسی نے ہمیشہ عام موضوعات کو اپنے ڈراموں کا حصہ بنایا ہے۔ اس ضمن میں ان کے ڈرامے

"فاصلوں کے درمیاں" میں پیش ہونے والا ایک منظر مکالمے سمیت ملاحظہ ہو۔ایسے واقعات منطقی اور حقیقی ہیں جو ہمارے ساتھ عموماً پیش آتے رہتے ہیں۔مثلاً:

(کار پارکنگ میں بیرسٹر کاشف اپنی گاڑی کے پاس آکر کار کا دروازہ کھولتا ہے تو ساتھ والی گاڑی سے کمال الدین کہتا ہے)

کمال الدین: "میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا بیرسٹر صاحب!" کاشف: "فرمایئے کیا بات ہے؟" کمال الدین: "آپ نے میرے پاپا کی طرف سے دیے جانے والے قانونی نوٹس کے جواب میں مقدمہ تو دائر کر دیا ہے لیکن ایک بات یاد رکھیں اور وہ یہ کہ ہمارے آباؤ اجداد کی اتنی قیمتی اراضی آپ اس قدر آسانی سے ہڑپ نہیں کر سکیں گے۔" کاشف:"یہ بات تو آپ کو اپنے پاپا کو سمجھانی چاہیے تھی ہمیں نوٹس دینے سے پہلے" کمال الدین: "لیکن فی الحال تو میں آپ کو سمجھانے آیا ہوں کہ ہمارے ساتھ اس قدر ہٹ دھرمی سے پیش نہ ہی آئیں تاکہ آپ کو بعد میں پشیمان نہ ہونا پڑے۔" کاشف: "میں ہٹ دھرمی نہیں کر رہا کمال الدین بلکہ آپ لوگوں کی طرف سے دیے جانے والے قانونی نوٹس کا دفاع کر رہا ہوں جو میرا لیگل رائٹ ہے۔" کمال الدین: "تو پھر ٹھیک ہے، ہم اپنی قانونی جنگ جاری رکھیں گے اور آپ اپنا دفاع کرتے رہیں بیرسٹر کاشف عبدالرحمان!" کاشف: "زیادہ گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر!"(۵)

یونس قیاسی کے ڈرامے فکری و موضوعاتی حوالے سے ہمارے معاشرے اور روایات کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ کے ڈراموں میں پختون معاشرہ، فطرتِ انسانی، عورتوں کے حقوق، قبائل کے رسوم و روایات، آزادی، پولیس کی کارکردگی، عورت کا زندگی میں اہم مقام و کردار، جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت، مشترکہ خاندانی زندگی، غربت، انتقام، مختلف معاشرتی رویے، دولت کے نشے میں مگن معاشرہ، محبت جیسے پاک جذبے کی قدر اور انسانی نفسیات کی خوب صورت عکاسی ملتی ہے۔انہی خوبیوں کی وجہ سے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے یونس قیاسی کو اس صوبے کا "ورسٹائل ڈرامانگار" کہا ہے:

یونس قیاسی میرے نہایت قریبی ساتھی ہیں۔اس کے ڈراموں پر اکثر ہماری بحثیں ہوتی ہیں۔وہ ایک خاص موضوع کے رائٹر نہیں۔اسے جو بھی موضوع مل جائے، چند ہی روز میں وہ ایک اعلیٰ سکرپٹ تیار کرلے گا۔کیونکہ وہ ایک ورسٹائل ڈرامانگار ہے۔

پلاٹ کے بغیر کسی ڈرامے کا تصور کرنا ممکن نہیں۔ عشرت رحمانی ڈرامے کے پلاٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> پلاٹ کے انتخاب میں ڈرامہ نگار کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی پہلو کو سامنے رکھ کر جس واقعہ کو واقعہ کو بھی منتخب کرے اس کے جذبات پر پوری نظر رکھتا ہو اور اس کے حسن و قبیح کا غائر مطالعہ ہو تا کہ فطرت انسانی کی کامل نقاشی کر سکے۔ (۷)

یونس قیاسی کے ڈراموں کو سادہ، مربوط اور مسلسل پلاٹ کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل ہے۔ ان کے ڈراموں کے پلاٹ میں ایک روانی، تسلسل، تجسس اور تذبذب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے ڈرامے اسی حوالے سے ڈرامائی تکنیک کی پاسداری کرتے ہوئے مسلسل عروج اور انجام کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں ان میں کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا۔ قیاسی کے ڈراموں کا انجام غیر متوقع نہیں بلکہ منطقی ہوتا ہے۔ پختہ فکر ہونے کی وجہ سے آپ کے ڈراموں کا پلاٹ بھی انتہائی پختہ، مضبوط و شاندار ہوتا ہے۔ فرحت اللہ قریشی موصوف کے ڈراموں کے پلاٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> یونس قیاسی کے ڈراموں کا پلاٹ ان کی ذہنی پختگی کی طرح پختہ اور مضبوط ہوتا ہے۔ (۸)

یونس قیاسی نے ڈراموں میں کردار نگاری کے حوالے سے مثبت ذہنیت کا استعمال کیا ہے۔ چونکہ آپ خود مثبت ذہنیت کے حامل ہیں، اس لیے آپ کے کردار بھی مثبت ہیں۔ اگر پلاٹ کی ضرورت کے مطابق آپ کے چند کردار منفی بھی ہوں تو وہ بھی آخر میں مثبت عمل کی طرف آئیں گے یا آخر میں ان منفی کرداروں کو شکست ہو گی۔ مختصراً قیاسی اپنے فن کے ذریعے مثبت جذبے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ دنیا مثبت عمل اختیار کرے اور لوگ آپس میں نفرتوں کی بجائے محبت بانٹیں اور معاشرے میں امن کا علم بلند ہو۔

یونس قیاسی کی مضبوط کردار نگاری کے باعث ان کے ڈراموں کے اکثر کردار اتنے مشہور ہوئے کہ لوگ ان کو اصل ناموں کی بجائے قیاسی کے دیے ہوئے ناموں سے پہچانتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو اہم کرداروں کے نام "نورینہ" اور "فرازے" کے ہیں۔ نورینہ کا کردار ڈراما "نورینہ" اور فرازے کا کردار ڈراما "انگار" میں شامل ہے۔ اس مد میں پروڈیوسر طارق سعید کا کہنا ہے:

> قیاسی کی ڈراما نگاری میں کردار نگاری اہم حصّہ ہے۔ آپ نے بعض کرداروں کو ان کے اصل ناموں سے بھی زیادہ شہرت دلوائی مثلاً ڈراما "انگار" کے طارق جمال کو لوگ اب بھی فرازے کے نام سے پہچانتے ہیں۔ (۹)

یونس قیاسی کی ڈراما نگاری کی ایک اور اہم خصوصیّت مکالمہ نگاری ہے۔ آپ مکالمہ نگاری کے فن سے پوری طرح واقف ہیں۔ مختصر اور جامع مکالمے لکھنا آپ کا خاصہ ہے۔ آپ کے ڈراموں میں مکالمے کرداروں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی کردار ڈاکٹر ہے تو اُس کی زبان و مکالمے ڈاکٹروں والے ہیں، کوئی پولیس والا ہے تو اُس کی زبان بھی پولیس والوں جیسی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کردار نوکر یا ڈرائیور ہے تو اُن کی زبان و طرزِ ادا بالکل اُن کے مزاج اور کردار کے مطابق ہے۔ یونس قیاسی مکالمہ نگاری میں ہدایت کار کی آسانی کے لیے مختلف اشاروں، واضح نشانات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ ان کی مکالمہ نگاری کے حوالے سے سعد اللہ جان برقؔ کہتے ہیں کہ:

> یونس قیاسی فن ڈراما نگاری سے واقف ڈراما نگار ہے۔ ڈرامے کی تکنیک کا ہر حوالے سے خیال رکھتے ہیں اور فن مکالمہ نگاری میں تو اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ (۱۰)

ڈرامے کے فن میں منظر نگاری کی ضرورت و اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ ٹیلی وژن ڈراموں کے لیے ماہرین نے منظر کشی کے حوالے سے اصول متعین کیے ہیں۔ جس کی پیروی کرتے ہوئے ڈراما نگار سادہ اور موثر طریقے سے فن منظر نگاری کا اظہار کر سکتا ہے۔ صنفِ ڈراما پر تحقیق کے حوالے سے ایک بڑی شخصیت، عشرت رحمانی ڈراما نگاری میں مناظر کی پیش کش کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> اسٹوڈیو کی حدود کے پیش نظر مناظر کی ترتیب میں سادگی لازم ہے۔ جگہ اور وقت کی قلت بھاری سیٹ کی آراستگی اور بار بار منظر کی تبدیلی کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے دو تین سے زیادہ سیٹ (مناظر) مناسب نہیں۔ بیرونی مناظر جن سے واقعات کی دل چسپی اور اثر میں کوئی خاص اضافہ ہوتا ہو، دو ایک دکھائے جاسکتے ہیں لیکن ان کی مدت ڈرامے کے دوران کے تناسب سے مجموعی ۵۔۱۰ فیصد سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ (۱۱)

ڈراما کرداروں کی نقل و حرکت پر مبنی ہوتا ہے اس لیے ان کی حرکات و سکنات اور مکالمات کا مخصوص منظر میں پیش کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اور الفاظ کی مدد سے کسی منظر کا پیش کرنا ماہر فن کا کام ہے اور یونس قیاسی اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اپنے ڈراموں میں منظر کشی اتنی خوب صورت کرتے ہیں کہ سکرپٹ پڑھنے والا منظر کو بالکل اپنے سامنے دیکھتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ڈائریکٹر کی سہولت کے لیے کسی منظر کو پیش کرتے ہوئے کرداروں کی حرکت و عمل کی تفصیل سمیت کیمرے کی نقل و حرکت کے بارے میں تفصیل لکھ کر ہدایت کار اور کیمرہ مین کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔ معروف ڈائریکٹر و پروڈیوسر اور یونس قیاسی کے ساتھ مختلف پراجیکٹس میں کام کرنے والے عزیز اعجاز موصوف کے ڈراموں میں منظر کشی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

یونس قیاسی کے ساتھ جن ہدایت کاروں اور پیش کاروں نے بھی کام کیا ہے،وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ قیاسیؔ جیسے مایہ نازاور فنِ ڈراما نگاری سے بھرپور واقفیت رکھنے والی شخصیت کی تخلیق کردہ منظر کشی کو سکرین پر پیش کرنے کے لیے ہمیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ (۱۲)

یونس قیاسی کے ڈرامے "گمنام راستے" کا ایک منظر جس میں مصنف سادہ الفاظ میں قاری کے سامنے تمام تفصیلات پیش کر کے کیمرہ کے لیے بھی ہدایات درج کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

ہسپتال کے آپریشن تھیٹر کا بیرونی منظر جہاں شمالہ بت بنی کھڑی ہے،صفیہ ساتھ ہے۔کیمرہ پین کر کے دکھاتے ہیں، دفتر کے کچھ لوگ بھی پریشان کھڑے ہیں۔ڈاکٹر باہر آتا ہے۔صفیہ آگے بڑھ کر پوچھتی ہے۔صفیہ: "ڈاکٹر صاحب"! ڈاکٹر: صرف ہاتھ کے اشارے سے صفیہ کو صبر کرنے کے لیے کہتا ہے اور آؤٹ ہو جاتا ہے۔ (صفیہ شمالہ کی طرف دیکھتی ہے، پھر اس کے قریب جا کر اس کے گال پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتی ہے۔وہی ڈاکٹر واپس آتا ہے اور ایک اور ڈاکٹر کو ساتھ لے کر اندر جاتا ہے،صفیہ اور شمالہ انہیں دیکھتی رہ جاتی ہیں۔پھر کیمرہ پین کر کے دفتر کے ملازمین میں سے ایک ایک کو غم زدہ کھڑا دکھاتے ہیں۔آپریشن تھیٹر کا دروازہ پھر کھلتا ہے۔وہی ڈاکٹر باہر آتا ہے،شمالہ اس کے قریب آکر پوچھتی ہے) (۱۳)

یونس قیاسی مہذبانہ لب ولہجہ، منفرد اسلوب،انوکھے، بہترین اور دل چسپ موضوعات رکھنے کی وجہ سے خیبر پختونخوا میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔جیسا کہ انہوں نے سٹیج، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے اُردو، پشتو اور ہندکو کے متعدد ڈرامے لکھے ہیں مگر قیاسی کے اُردو ڈراموں نے قومی و بین الاقوامی سطح پر مقبولیت و شہرت حاصل کی اور قارئین و ناظرین ایک عرصے تک ان ڈراموں سے محظوظ ہوتے رہے۔یونس قیاسی کے مقبول و معروف ڈراموں میں ا۔زرد پتے،۲۔بدصورت چاند،۳۔مٹی کا قرض،۴۔سایہ،۵۔کونج،۶۔واپسی،۷۔نورینہ،۸۔انیتا،۹۔ہم سفر،۱۰۔آدھے راستے،۱۱۔لاوا،۱۲۔دیوار،۱۳۔کفارا،۱۴۔دیکھ تماشا دیکھ،۱۵۔رہائی،۱۶۔دیمک،۱۷چنار،۱۸۔کھجور میں اٹکا،۱۹۔فاصلوں کے درمیاں وغیرہ شامل ہیں۔ان ڈراموں میں سے چند مشہور ڈراموں میں یونس قیاسی کا ڈرامائی فن اعلیٰ مقام پر محسوس ہوتا ہے۔

پشاور ٹیلی وژن مرکز سے نیشنل سرکٹ پر پورے پاکستان سے ٹیلی کاسٹ ہونے والا یونس قیاسی کا پہلا طبع

زاد سیریل "کونج" ہے۔ جس کو پہلے ہندکو میں پیش کیا گیا تھا۔ ہندکو میں اس ڈرامے کی مقبولیت دیکھ کر پشاور ٹی وی کے جنرل منیجر کنور آفتاب کی خواہش پر اسے اگلے سال قیاسی ہی کے قلم سے اُردو میں پیش کیا گیا۔ جسے پورے ملک میں پسندیدگی کی سند عطا کی گئی۔ اسی طرح یونس قیاسی کا "نورینہ" رضیہ بٹ کے مشہور ناول "نورینہ" سے ماخوذ ہے۔ رضیہ بٹ کی فرمائش پر قیاسی نے ان کے ناول کو ڈرامائی تشکیل دی۔ یہ ڈراما پی ٹی وی پشاور مرکز سے نیشنل سرکٹ پر ٹیلی کاسٹ ہوا۔ اس ڈرامے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ناظرین سمیت ناقدین بھی اس ڈرامے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ خود رضیہ بٹ قیاسی کی ڈرامائی تشکیل سے کافی متاثر ہوئیں۔ پی ٹی وی ایوارڈز انتظامیہ نے ڈراما "نورینہ" کی مقبولیت کو سراہتے ہوئے اسے پی ٹی وی ایوارڈ سے بھی نوازا۔

ڈراما "نورینہ" کی مقبولیت دیکھ کر رضیہ بٹ نے اپنے دوسرے شاہکار ناول "انیتا" کی بھی ڈرامائی تشکیل کی خواہش کا اظہار کیا جس کے لیے ایک دفعہ پھر یونس قیاسی سے رابطہ کرنا پڑا۔ انہوں نے اس ناول کو بھی ڈرامے کا لبادہ پہنا کر ٹیلی وژن کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ یہ ڈراما کوئٹہ ٹیلی وژن سنٹر سے نیشنل سرکٹ پر ٹیلی کاسٹ ہوا۔ جس کی ہر جانب سے پذیرائی ہوئی۔ ان ڈراموں سے خیبر پختونخوا کے ڈراما نگاروں کا نام پاکستان کے دوسرے مراکز میں بھی عزت و احترام سے لیا جانے لگا۔ یونس قیاسی کے مشہور ڈراموں میں سے ایک اہم ڈرامہ "لاوا" بھی ہے۔ اس ڈرامے کو پی ٹی وی کے نیشنل ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ جس میں پروڈیوسر اور لکھاری دونوں کی نامزدگی ہوئی تھی۔

یونس قیاسی نے ڈراما "ہم سفر" سابق وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا سردار مہتاب عباسی کی فرمائش پر پی ٹی وی کے لیے لکھا۔ اس ڈرامے میں صوبے کے اہم ادارے "خیبر پختونخوا پولیس" کی قربانیوں اور ان کی بے لوث خدمات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس صوبے میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ڈراما تھا جسے ہر طرف سے پسندیدگی کی سند عطا کی گئی۔ ڈراما "ہم سفر" پاکستان ٹیلی وژن پشاور مرکز سے نیشنل ٹی وی سرکٹ پر ٹیلی کاسٹ ہوا۔ اس ڈرامے پر بھی یونس قیاسی کو دیگر اعزازات سمیت "فرنٹیر ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا اسی طرح سے یونس قیاسی کا مشہور رومانوی ڈراما "فاصلوں کے درمیاں" بھی پشاور ٹی وی سے نیشنل سرکٹ پر ٹیلی کاسٹ ہوا۔ اس ڈرامے کے پروڈیوسر عزیز اعجاز تھے۔ اس ڈرامے نے مقبولیت کے ریکارڈ بنائے اور اشتہارات کے مد میں پی ٹی وی پشاور کے لیے اچھا خاصا منافع کمایا۔

مجموعی لحاظ سے یونس قیاسی صوبہ خیبر پختونخوا کے کامیاب ترین ڈراما نگاروں میں سے ہیں۔ جنہوں نے مختلف موضوعات پر کامیابی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے چونکہ فن ڈراما نگاری کو دل سے اپنایا اور اس فن کے حوالے سے ناقدین سے داد وصول کی۔ نامور ڈراما نگار امجد اسلام امجد آن کے ڈرامائی فن کے حوالے سے اپنے زریں

خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جب بھی کبھی پشاور ٹیلی وژن کے نامور اور معیاری لکھاریوں کی فہرست تیار کی جائے گی تو یونس قیاسی کا نام اس میں سر فہرست ہو گا۔ (۱۴)

مختصر یہ کہ یونس قیاسی کے فن ڈراما میں موضوعات کے اعتبار سے آفاقیت پائی جاتی ہے۔ ان کے ڈراموں میں فنی و تکنیکی اعتبار سے روایت اور جدیدیت کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں بے جا تفصیل بندی سے گریز کیا گیا ہے۔ انہوں نے مطلب و معانی کو اہمیت دی ہے۔ قیاسی اپنے ڈراموں میں ایک طرف ہمیں عصری مسائل سے آگاہ کرتے ہیں تو دوسری طرف ہمیں نئے احساسات و جذبات سے بھی ہمکنار کرتے ہیں۔ انہی خصوصیات کی بنا پر یونس قیاسی کو صوبہ خیبر پختونخوا کے صفِ اوّل کے ڈراما نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یونس قیاسی کو ڈراما نگاری، کالم نگاری اور شاعری میں ادب کی خدمات سر انجام دیتے ہوئے متعدد اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ ان کو پی ٹی وی ایوارڈ سمیت مختلف طبقہ فکر نے انعامات و ایوارڈز سے نوازا ہے۔ جن میں سرحد ایوارڈ، فاطمید شیلڈ، پی ٹی وی ایوارڈ، بیسٹ سروس شیلڈ، فرنٹیئر ایوارڈ، خیبر ایکسیلنٹ ایوارڈ، فرنٹئیر فاؤنڈیشن شیلڈ، ہزارہ آرٹس کونسل شیلڈ، ایگفا ایوارڈ، حمید نظامی ایوارڈ، اسلامک ری پبلک آف ایران شیلڈ اہم ہیں۔

یونس قیاسی اردو ادب کی خدمت کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے ادب کی ترویج کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ انہوں نے صحافت، شاعری، افسانہ نگاری، کالم نگاری، ڈراما نگاری اور فلم نگاری میں خوب نام پیدا کیا۔ انہوں نے اردو ڈرامے کی ترویج و اشاعت اور اس صنف کو ترقی سے ہمکنار کرنے کے لیے اس فن کو اولیت بخش کر شہرت و نام دیا۔ انہوں نے خیبر پختونخوا میں جدید اردو ڈرامے کی ایک نئی روایت رقم کی۔ اردو ڈرامے میں اپنے ارد گرد کے سماج میں پھیلے مسائل کی عکاسی نہایت باریک بینی سے اپنے ڈراموں میں کی۔ انہوں نے نہ صرف فن ڈراما نگاری کو چار چاند لگائے بلکہ اردو ادب کی باقی اصناف میں بھی طبع آزمائی کر کے شہرت دوام حاصل کی۔

حوالہ جات

۱۔ ابراہیم یوسف، فن ڈراما نگاری، کراچی، ماہنامہ نگار، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص:۱۰۴

۲۔ محمد اسلم قریشی، ڈاکٹر، برصغیر کا ڈراما (تاریخ افکار اور انتقاد)، لاہور، اردو اکیڈمی مغربی پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص:۴۲۹

۳۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تاریخ اصناف نظم و نثر، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۷ء، ص:۳۹۱

۴۔ یونس قیاسی، "قیاس آرائیاں"، پشاور، بختیار اینڈ سنز قصّہ خوانی بازار، ۲۰۰۹ء، ص:۸

۵۔ یونس قیاسی، "فاصلوں کے درمیاں (اصل سکرپٹ)"، قسط نمبر ۱۴، پی ٹی وی پشاور مرکز، ۲۰۰۹ء، ص:۰۴

۶۔انٹرویو،یونس قیاسی،پی ٹی وی سنٹر پشاور،۰۸ مئی ۲۰۰۹ء،بوقت شام ۷ بجے
۷۔ عشرت رحمانی،اردوڈرامے کی صدی، مشمولہ،،"اردو ڈراما کا ارتقا"،لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۸۶ء،ص: ۱۴۔۱۵
۸۔یونس قیاسی،"قیاس آرائیاں"،پشاور،بختیار اینڈ سنز قصّہ خوانی بازار، ۲۰۰۹ء،ص:۱۰
۹۔انٹرویو،یونس قیاسی،پی ٹی وی سنٹر پشاور،۰۸ مئی ۲۰۰۹ء،بوقت شام ۷ بجے
۱۰۔یونس قیاسی،"قیاس آرائیاں"، ص:۱۸
۱۱۔ عشرت رحمانی،"اردو ڈراما کا ارتقا"،ص:۷۵۸
۱۲۔انٹرویو،یونس قیاسی، پی ٹی وی سنٹر پشاور،۰۸ مئی ۲۰۰۹ء،بوقت شام ۷ بجے
۱۳۔یونس قیاسی،"گمنام راستے(اصل سکرپٹ)"،قسط نمبر ۱،پی ٹی وی پشاور مرکز،۱۹۸۴ء،ص:۲۰
۱۴۔امجد اسلام امجد،فلیپ،"قیاس آرائیاں"از یونس قیاسی،پشاور،بختیار اینڈ سنز قصّہ خوانی بازار،۲۰۰۹ء، ص:۱۱

References in Roman Script:

1. Ibrahim Yousuf, Fan e Darama Nigaari, Mhanama Afkar, Karachi, December 1966, P.104
2. Quraishi, Dr.M Aslam, Bar e Sagheer Ka Darama(Tareekh awr Inteqaad), Urdu Acadmey, Magharbi Pakistan, Lahore, 1987, P.429
3. M.Ashraf, Dr, Tareekh e Asnaaf e Nazm o Nasar, City Book Point, Karachi, 2017, P.391.
4. Younus Qayasi, Qayas Araeiyan, Bakhtiyar and Sons, Qissa Khawni Bazar, Peshawar, 2009, P.8
5. Younus Qayasi, Faslon kay Darmiyan, (Asal Script) Qist No 41, PTV, Peshawar Markaz, 2009, P.4
6. Younus Qayasi (Interveiw), PTV Cenre, Peshawar, 08 May 2009. Waqt 7PM,
7. Ishrat Rehmani, Urdu Daramy ki Sadi, Mashmoola Urdu Daramy ka Irteqa, Sheikh Ghulam Ali and Sons, Lahore, 1986, P.14-15
8. Younus Qayasi, Qayas Araeiyan, P.10
9. Younus Qayasi (Interveiw), PTV Cenre, Peshawar, 08 May 2009. Waqt 7PM,
10. Younus Qayasi, Qayas Araeiyan, P.1٨
11. Ishrat Rehmani, Mashmoola Urdu Daramy ka Irteqa, 1986, P.٧٥٨
12. Younus Qayasi (Interveiw), PTV Cenre, Peshawar, 08 May 2009. Waqt 7PM,
13. Younus Qayasi, Gumnaam Rasty (Asal Script), Qist No 1, PTV , Peshawar Markaz, 1984, P.20
14. Amjad Islam Amjad, Flap, Qayas Araeiyan, Az Younus Qayasi, Bakhtiyar and Sons, Qisa Khawni Bazar,Peshawar, 2009, P.11.

DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.280

سعدیہ امتیاز

ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ۔

ڈاکٹر مشتاق عادل

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ ۔

خالد فتح محمد کے ناول زینہ میں سماجی شعور

Sadia Imtiaz
MPhil Scholar, Department of Urdu, University of Sialkot, Sialkot, Sialkot.
Dr. Mushtaq Adil
Associate Professor, Department of Urdu, University of Sialkot, Sialkot, Sialkot.

Social Counciousness in Khalid Fateh Muhammad's Novel "Zina"

ABSTRACT

Khalid Fateh Mohammad is one of the most famous novelists of the 21st century. His work is an interesting school of diverse themes, however, mainly about recurring mundane issues that concern common people. Khalid Fateh Muhammad's relatively recent novel زینہ is varied in its subject matter. He unpicks social evils and brings forth what follows at their heels, underlining their ramifications for our societal fabric. In this article, we have primarily analyzed the contribution of Khalid's novel زینہ in creating a particular kind of social consciousness in our society.

Keywords: *Relationship, Struggle, Problems, Society, Social Evils, Terrorism, Journalism, Contribution.*

خالد فتح محمد منفرد لہجے کے ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں میں سماجی شعور کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہر ناول میں ایک الگ تکنیک کا استعمال کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر ناول دوسرے

Received: 07th Aug, 2022 | Accepted: 08th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022
DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

ناولوں سے منفرد ہے۔ جس طرح سماجی بگاڑ اور معاشرتی مسائل پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے اس طرح ان کے ناولوں میں پیار محبت کے قصوں کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ملک کے سیاسی حالات، حکومتی اور ریاستی طاقتوں کے کردار کو بیان کیا ہے۔ سماجی بگاڑ کی تصویر کشی کی ہے اور ان کے سدباب کے لیے تجاویز پیش کی ہیں۔

ناول "زینہ" خالد فتح محمد کی ایک منفرد کاوش ہے۔ پورے ناول میں مرکزی کردار خود سے مخاطب ہے۔ یہ واحد متکلم بیانیے میں لکھا گیا ناول ہے۔ اس ناول کا ہر کردار بلا کا ذہین اور طاقتور دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار حلیم معاشرے کے ایسے نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے جو آوارہ اور بگڑے ہوئے ہیں۔ یہ ناول مجلسی، معاشی، صحافتی اور سماجی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لینے کے ساتھ ساتھ رومانس اور محبت کی بھی عمدہ کہانی پیش کرتا ہے۔ دہشتگردی اور افراد کے لاپتہ ہونے سے متعلق بھی بات کی گئی ہے۔ ناول کے تمام کردار ایسے ہیں جو ہمارے ارد گرد گھومتے ہیں جو اپنے ظاہر اور باطن سے مختلف ہیں اور کامیابی کا زینہ طے کرنے کے لیے ہر وہ کام بھی کرتے ہیں جو معاشرے میں ناپسند سمجھا جاتا ہے۔ ناول میں کرداروں کی جرات اور فیصلہ سازی کی قوت کسی غیبی مدد سے آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ ناول میں ہونے والے انکشافات قاری کو کھٹکنے کی بجائے چونکاتے ہیں۔ جو قاری کو بوریت کا شکار نہیں ہونے دیتے۔

ناول میں صحافت جیسے ایمان دار اور مخلصانہ پیشے کے معیار کو گرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ کیسے ہمارے ملک میں چند پیسوں کی خاطر اس پیشے کو گندا کیا جارہا ہے۔ رشوت لے کر جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ صحافی لفافہ لے کر خبریں اپنی مرضی کی شائع کرتے ہیں اور چند روپوں کی خاطر اپنا ایمان بیچتے ہیں۔ اس کی عکاسی خالد فتح محمد نے "زینہ" میں کی ہے:

> "میری شہرت کچھ ایسی ہی ہے کہ میں مال لیتا ہوں جو بہت غلط بھی نہیں۔ لیتا ہوں یار جی! زندہ بھی رہنا ہے۔ صحافت ایک ایماندار اور مخلصانہ پیشہ ہے لیکن ہر پیشے کی کچھ ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ جن کو مجھے بھی اپنانا پڑا۔"(۱)

ہمارے معاشرے میں مذہب اور فرقہ دو الگ الگ سوچیں بن گئی ہیں۔ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں کے دشمن بن گئے ہیں۔ ہر فرقہ اور مذہب کے لوگ دوسرے مذہب اور فرقے کو خود سے کمتر سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ بھی مذہب کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے ہیں جو مذہب کو خود بھی ٹھیک سے نہیں سمجھتے۔ سیاست اور مذہب کے نام پر میدان کارزار برپا کروایا جاتا ہے۔ مذہب کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جھوٹی اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے مذہب اور فرقے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ فرقوں کے درمیان لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ ایک

فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں کی عزت نہیں کرتے۔ فرقوں میں فرق سمجھ کر ایک دوسرے پر حملے کروائے جاتے ہیں۔ جس سے زندگی اپاہج ہو کر رہ جاتی ہے۔ ملک میں حملے اور دھماکے عام ہو جاتے ہیں۔ ناول نگار اس بات کی عکاسی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ان کے نزدیک مذہب اور فرقے دو الگ الگ سوچیں بن گئیں تھیں۔ جس کے نتیجے میں کسی کو کسی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ ایک فرقے والے دوسرے کے دشمن تھے اور فرقوں کے اندر بھی دشمنیاں تھی۔ کوئی کسی کو معاف کرنے اور قبول کرنے کے حق میں نہیں تھا۔"(۲)

سائنس کی ترقی نے اخلاقیات کو متاثر کیا ہے۔ ہر انسان پیسے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ پیسے کے لالچ میں انسان اتنا اندھا ہو گیا ہے کہ ناجائز ذرائع سے کمانا بھی حلال سمجھتا ہے۔ انسان نے اپنے ایمان کو بیچ کر بے ایمانی کو ہی اپنا ایمان بنالیا ہے۔ آج کے اس دور میں ہر انسان خود غرض ہے صرف اپنا فائدہ سوچتا ہے اسے دوسرے کے نقصان کی کوئی فکر نہیں۔ پھیری والا ہو یا دوکان دار، سیلز مین ہو یا بزنس مین ہر انسان اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے بے ایمانی کا سہارا لے رہا ہے۔ لوگ بے حس ہو گئے ہیں کسی کے نقصان کی فکر کیے بغیر اپنے فائدے کا سوچتے ہیں۔ پیسے کے لالچ میں حلال اور حرام کی پہچان بھول گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مفاد کی خاطر رشتوں کی تمیز بھول گئی ہے۔ ناول میں معاشرے کی اس برائی کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"نیچے بازار میں زندگی کا معمول تبدیل ہو گیا ہے۔ خود غرضی نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے۔ ایمانداری اب ایک عیب سمجھی جاتی ہے اور بے ایمان ہونا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ ہر کوئی دولت سمیٹتے ہوئے دوسرے کا حصہ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ لوگوں میں عجب بے حسی در آئی تھی۔ جن حالات میں زندگی گزر رہی تھی ان حالات میں زندگی گزارنا ناممکن سا ہو گیا تھا۔ لیکن لوگ پھر بھی جیئے جا رہے تھے۔"(۳)

پاکستان کا تعلیمی معیار خراب ہوتا جا رہا ہے لوگ سیکھنے کی بجائے نمبروں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ تعلیمی نصاب بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ تعلیم کے میدان میں ہر کوئی نمبر حاصل کرنے کی دوڑ میں ہے۔ تعلیمی نصاب میں منطق پیدا کرنے کی بجائے بے دلیلی در آئی ہے۔ نہ تو تعلیم کا معیار بہتر ہو رہا اور نہ ہی تعلیمی نصاب ایسا ہے کی بچوں کی شخصیت میں نکھار پیدا ہو اور ان کو کچھ سیکھنے کو بھی ملے، بلکہ بچوں کی سوچ ایسی بنا دی ہے کہ بس نمبر زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں لگے ہیں۔ جو تعلیمی نصاب پڑھایا جا رہا ہے وہ مغربی تعلیم کا درس دیتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نصاب سے ہمارے تاریخی اور مذہبی مواد کو ختم کیا جا رہا ہے اور بتدریج ایسا تعلیمی نصاب لایا جا رہا ہے جو ملک کی تاریخ اور اسلامی

تعلیمات سے ہماری آنے والی نسلوں کو بے خبر اور انجان رکھ رہا ہے۔اس پہلو کی عکاسی خالد فتح محمد نے "زینہ" میں بہت خوبصورت انداز میں بیان کی ہے:

> "تعلیم کے معیار بدل گئے تھے اور لوگ علم کی بجائے نمبروں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔اور نصاب میں منطق کی بجائے بے دلیلی در آئی تھی۔اور جو پڑھایا جا رہا تھا وہ دراصل تعلیم کا حصہ نہیں تھا۔ہم دونوں جہالت زدہ تعلیم کو علم میں تبدیل کرنے کی تگ ودو کر رہے تھے۔"(۴)

سیاستدان چند سال سیاست میں آکر ڈھیروں دولت حاصل کر لیتے ہیں۔اور بہت سا سرکاری رقبہ ناجائز قبضوں کے ذریعے سرکاری افسروں کے ساتھ مل کر اپنے نام کروالیتے ہیں اور کچھ رقبہ غریب اور مجبور عوام کو ڈرا دھمکا کے ان سے سستے داموں خرید لیتے ہیں۔کچھ سیاست دان تو ایسے ہیں جن کے پاس حکومت میں آنے سے پہلے پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی یا پھر ایکڑ دو ایکڑ زمین ہوتی ہے۔وہ لوگ حکومت میں آتے ہی بہت سی زمینوں پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ان سیاسی لوگوں کے اپنے کاروبار تو باہر کے ملکوں میں ہوتے ہیں اور یہاں غریب عوام کا خون چوستے ہیں۔یہاں سے پیسہ اکٹھا کر کے باہر کے ملکوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں۔یہاں کی زمینیں ان کے لیے بے معنی اور دکھاوا ہوتی ہیں۔سیاست میں آکر یہ لوگ عوام کے پیسے ٹیکسوں کی صورت میں بٹورتے ہیں اور اپنا کاروبار چمکاتے ہیں۔ان کے بینک بیلنس عوام کے پیسوں سے بڑھے ہوتے ہیں۔سیاست میں آنے سے پہلے بڑے بڑے دعوے کرتے اور غریب عوام کو سبز باغ دکھاتے ہیں کہ ہم سیاست میں آکر آپ لوگوں کے لیے کام کریں گے لیکن سیاست میں آتے ہی صرف ملک کا پیسہ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اس کے مظاہر اس ناول میں نظر آتے ہیں:

> "دوسرے وہ تھے جنہوں نے سیاست میں آنے کے بعد سوچ سے بھی زیادہ رقبہ ناجائز قبضوں اور سرکاری زمینوں کے محکمہ مال کے افسروں کے ساتھ مل کر ہتھیا لیا تھا یا ضرورت مندوں سے سستے داموں خرید لیا تھا۔میرے علم میں آیا کہ ایک ایسا سیاست دان جس کے باپ کی پندرہ سال پہلے تین ایکڑ زمین تھی اب وہ تین ہزار ایکڑ کا مالک تھا۔ایسے لوگوں کی زمین ان کے لیے غیر اہم تھی کیونکہ وہ باہر کے ملکوں میں بھی اپنے کاروبار قائم کر چکے تھے۔"(۵)

ملک کو دہشت گردی نے بہت متاثر کیا ہے۔خودکش دھماکے ہوتے ہیں۔دہشت گرد نوجوانوں کو جنت کا لالچ دے کر خودکش دھماکے کے لیے تیار کرتے ہیں۔نوجوانوں کو مختلف سنٹروں میں تربیت دی جاتی ہے اور ان کو ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر دیا جاتا ہے۔ان کی سوچ ایسی بنا دی جاتی ہے کہ وہ جنت کے لالچ میں اپنی جان دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔لیکن اگر لوگ ان نوجوانوں کو دنیا میں جنت بنانے کی تربیت دیں تو یہ ملک دہشت گردی سے پاک ہو

جائے اور امن کا گہوارہ بن جائے۔ملک دشمن پاکستان کو دہشت گردی کی لپیٹ میں لے رہے ہیں۔ دہشت گرد نوجوانوں کو لالچ دیتے ہیں کہ خود کش دھماکے کے بعد وہ شہید کہلائیں گے اور جنت میں حوریں ان کا انتظار کر رہی ہوں گی وہ تمہارے گلے میں پھولوں کا ہار پہنائیں گی۔خود کش دھماکے میں وہ اپنی تو جان لیتے ہی ہیں ساتھ کئی بچے یتیم ہو جاتے ہیں،ماؤں کے اکلوتے بیٹے چلے جاتے ہیں اور کئی عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔لیکن ان کو فرق نہیں پڑتا یہ جنت کے لالچ میں معصوم جانیں لے لیتے ہیں۔آئے روز کسی مسجد،مدرسے،کالج اور سکول میں خود کش دھماکوں سے معصوم لوگوں کی جانیں لے لی جاتی ہیں۔اصل میں یہ جہادی پیدا کیے گئے تھے جب روس نے افغانستان پر حملے کیے تھے تو امریکہ کے کہنے پر افغانستان کی مدد کرنے کے لیے ان کو پاکستان میں تیار کیا جاتا تھا۔لیکن پھر روس تو افغانستان سے نکل گیا اور افغانستان خالی ہو گیا لیکن بعد میں یہی مجاہد بمبار بن گئے اور خود کش دھماکے کرنے لگے۔خالد فتح محمد نے دہشت گردی کے مسائل کو "زینہ" میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کیسے یہ نوجوانوں کو ورغلاتے ہیں:

> "خود کش دھماکے کرنے والوں کو جنت کی رسید دی جاتی تھی اور انہیں اوپر جنت میں بھیجنے والے اگر نیچے ہی جنت بنانے کی کوشش کرتے تو کچھ نا بگڑتا۔شاید پورا ملک ہی ان کا یرغمالی تھا۔"(۶)

ہمارے حکمرانوں نے اس ملک کے لیے کچھ نہیں کیا۔جب یہ حکمران اپوزیشن میں ہوتے ہیں تو عوام کو سبز باغ دکھاتے ہیں۔بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں کہ ہم حکومت میں آتے ہی نوکریاں دیں گے ،مہنگائی اور لوڈشیڈنگ ختم کریں گے وغیرہ وغیرہ۔جب انہی حکمرانوں کو عوام ان کے دعوؤں پر یقین کر کے اپنے ووٹوں سے حکومت میں لے آتی ہے تو حکومت میں آتے ہی یہ لوگ اپنی آنکھیں پھیر لیتے ہیں،اپنے تمام کیے گئے دعوؤں کو بھول جاتے ہیں۔پہلی حکومت کی طرح یہ بھی لوگوں کا خون چوستے ہیں۔مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ملک کو تباہی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔نہ صرف ملک کو تباہ کرتے ہیں بلکہ تعلیم جس کو ملک کی ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس کے تعلیمی نصاب تک کو مسخ کر دیتے ہیں۔ان حکمرانوں نے اپنی ملکی اور اسلامی تاریخ تک کو مسخ کر دیا۔تعلیمی نصاب سے اسلامی اور تاریخی مواد کو ختم کر کے مغربی طرز کے مواد کو شامل کیا جا رہا ہے۔حکمران صرف اپنا ذاتی مفاد دیکھتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تعلیمی نظام کو درہم برہم کر دیا جاتا ہے۔تعلیمی نظام کو ناقص بنا دیا گیا ہے اور ان کے اپنے کاروبار اور بچے باہر کے ملکوں میں سیٹ ہیں،اس لیے انہیں ملک کے نقصان سے کوئی غرض نہیں ہوتی ان کو جہاں اپنا مفاد نظر آتا ہے وہیں بک جاتے ہیں:

"حکومتوں نے اپنے مفاد کے لیے تعلیمی نصاب تک ناقص بنا دیئے ہیں۔ تاریخ مسخ کر دی ہے۔ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ نصاب میں کسی اور طرح درج ہے۔ یہ کیسے حالات کو صحیح کریں گے۔"(۷)

ہمارے معاشرے کا ایک المیہ جادو ٹونا ہے۔ آجکل جھوٹے اور جعلی پیروں نے جادو ٹونے کا کام شروع کیا ہوا ہے۔ ہر دوسرا بندہ جعلی پیر بنا بیٹھا ہے اور لوگوں سے پیسے بٹورتا ہے۔ ان کاموں پر سب سے زیادہ یقین عورتوں کا ہے۔ وہ جعلی بابوں اور پیروں کے پیچھے اپنا پیسہ ضائع کرتی ہیں۔ ان تعویذ گنڈوں کے چکروں میں گھروں کے گھر برباد ہو گئے۔ عورتوں نے اپنی خوبصورتی اور جوانی کو ان جادو ٹونوں کے چکروں میں چلے کاٹ کر ضائع کیا ہے۔ کمروں میں پندرہ پندرہ دن بند رہ کر جادو ٹونے کیے جاتے ہیں۔ کہیں ساس بہو کا جھگڑا ہے تو کہیں بیوی اور شوہر کی لڑائی جیسے کاموں کے لیے جھوٹے پیروں اور بابوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کالے جادو سے لوگوں کا سکھ چین تباہ کیا جاتا ہے۔ اس جادو ٹونے نے ہمارے معاشرے میں بگاڑ پیدا کیا ہوا ہے۔ اور اس میں سب سے زیادہ ہاتھ عورتوں کا ہے۔ گھروں میں جادو کرنے کے لیے کمرے مخصوص کیے جاتے ہیں اور ان کمروں میں موم بتیاں اور اگر بتیاں جلائی جاتی ہیں کہ یہاں کوئی جن بابا یا پہنچی ہوئی سرکار رہتی ہے۔ خالد فتح محمد نے اس جہالت کی بھی عکاسی کی ہے۔

"فہیم بیٹا! تمہاری ماں جادو کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ تمہارے نانے نے بھی اسی چکر میں اپنا گھر برباد کر لیا تھا۔ ہم نے یہ نہیں ہونے دینا۔ تم اپنی بہن کا خیال رکھا کرو تب مجھے ماں کے گھنٹوں کمرے میں بند رہنے کی وجہ سمجھ آئی۔"(۸)

نوجوان لڑکیاں کو کس طرح ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ناول نگار اس برائی کو سامنے لے کر آیا ہے کہ کیسے گھر سے بھاگی ہوئی عورت کو ذلت اٹھانی پڑتی ہے:

"تمہیں شاید ایسا مسئلہ نہ ہو کیونکہ تم گھر سے بھاگی ہوئی ہو۔ جو گھر سے بھاگ جاتی ہیں وہ کہیں کی بھی نہیں رہتی۔ اسے خاوند یا گھر والے جب چاہے نکال سکتے ہیں۔ تم ابھی تک محفوظ ہو۔ میں آج سوچوں گا کہ تمہیں رکھنا ہے کہ نہیں! آپا جان کا لہجہ دھیما، لاتعلق اور تیز دھار لیے ہوئے تھا۔"(۹)

ہمارے معاشرے میں عورت کو ہمیشہ سے ہی کمزور اور کمتر سمجھا جاتا تھا۔ عورت کو صرف گھر داری چلانے، بچے پیدا کرنے کی مشین اور ان کو سنبھالنے والی سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کو تعلیم نہیں دلوائی جاتی تھی اور گھر سے نکلنے والی ہر لڑکی کو غیر محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ مرد ہمیشہ عورت کو خود سے کمتر اور جاہل سمجھتا تھا۔ جیسے جیسے زمانے نے ترقی کی اور انسانوں میں شعور آیا تو عورت تعلیم کے میدان میں آگے آئی۔ تعلیم کو عورتوں کے لیے بھی لازمی سمجھا

گیا۔ آج عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہے۔ اور مرد کی ترقی میں عورت کا ہاتھ ہے۔ زندگی ہر شعبے میں عورت مرد کے برابر کام کر رہی ہے۔ اب یہ توہمات اور شکوک ختم ہو گئے ہیں کہ عورت گھر سے باہر محفوظ نہیں۔ اب عورت خود اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔ اپنی عصمت و آبرو کے لیے کوئی بھی قربانی دے سکتی ہے۔ اب عورت مضبوط ہے۔ اس نے معاشرے میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس پرانے رواج کو ختم کر دیا ہے کہ عورت ملازمت نہیں کر سکتی۔ ہمیں عورت کو تعلیم کے میدان میں اور زندگی کے ہر شعبے میں آگے لا کر ایک نئی ریت ڈالنی ہے تاکہ لڑکیاں نظام کی فرسودگی سے نکل کر ملازمت کی طرف مائل ہونے لگے :

"ہم نے فرزانہ کو کہیں ملازمت کروا کر وہاں ایک نئی ریت ڈالنا تھی فرزانہ کے بعد وہاں سے مزید لڑکیاں گھروں کی فرسودگی سے نکل کر ملازمت کی طرف مائل ہوں گی۔ مجھے خانزادہ کی باتوں سے حوصلہ ہوا۔ میں نے اسے اپنے توہمات اور خدشات سے آگاہ نہیں کیا۔"(۱۰)

ہمارے ملکی ادارے اور سیاست کے حوالے سے بھی ناول نگار حقیقت کو سامنے لے کر آیا ہے:

"خانزادہ کے مراسلے موصول ہو رہے تھے۔ وہ سوال پوچھتا کہ کیا ہمارا سیاست دان تربیت یافتہ نہیں یا ووٹر جو بار بار انہی لوگوں کو چنے جا رہا تھا جن پر وہ مسلسل الزام لگاتا رہتا کہ وہ ملک چلانے کے اہل نہیں؟ ایسا کیا تھا جو انہیں ہی ووٹ دیتا جنہیں وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ کیا ایسا کوئی طریقہ وضع کر دیا گیا تھا کہ انہیں اسی کو ووٹ دینا تھا جو ان کے ووٹ کا اہل نہیں تھا۔"(۱۱)

ملک میں دہشت گردی کا پہرا ہے۔ مسجدوں۔ امام بارگاہوں اور مندروں میں حملے کروائے جا رہے ہیں۔ فرقہ واریت کے نام پر قتل و غارت ہوتی ہے۔ ملک میں مسلسل دھماکے ہو رہے ہیں۔ لوگ آپس میں فرقوں کے نام پر لڑ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون کیا جا رہا ہے۔ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں پر حملے کر رہے ہیں۔ ہشت گردی نے ملک میں خوف و ہراس پیدا کیا ہوا ہے اور لوگوں کی جان اتنی سستی ہو گئی ہے کہ ان کا خون گلیوں، بازاروں اور سڑکوں میں عام بہتا ہے۔ لوگوں کی جانوں کی کوئی قیمت نہیں رہی دہشت گرد آپس میں ہی عوام کو فرقہ واریت کے نام پر لڑوا رہے ہیں۔ بے گناہ اور معصوم لوگوں کی جان لی جا رہی ہے۔ یہاں وہ لوگ مرتے ہیں جن کا قصور نہیں ہوتا اور ان لوگوں کو زندہ رکھا جاتا ہے جو قصوروار ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے معاشرے کے اس پہلو کی عکاسی اس طرح کی ہے:

"ملک میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے۔ اور لوگوں کی جان ان سڑکوں یا گلیوں اور بازاروں سے سستی تھی جہاں ان کا خون بہتا تھا۔ چودھری نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔ اس نے کہا کہ قتل و غارت وہی لوگ کر رہے جنہوں نے اسے روکنا تھا۔"(۱۲)

پاکستان امن کا گہوارہ تھا یہاں امن اور سکون تھا جو ملک دشمن لوگوں کو برداشت نہیں ہوا تو انھوں نے اسے نشانہ بنا لیا اب آئے روز صوبوں، فرقوں اور مذہب کے نام پر جانیں لی جاتی ہیں۔ خالد فتح محمد نے اس کو "زینہ" میں اس طرح بیان کیا ہے:

> "میں اس ریوڑ میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا جسے ہانکنے والے بے رحم تھے۔ یہ ایک پر امن معاشرہ تھا۔ جسے متشدد بنا دیا گیا ہے۔ یہاں صوبائیت، فرقہ واریت اور زبان کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اب ایک آسیب بن گیا ہے اور ہر گھرانہ اس کا نشانہ ہے۔ میں ایک طویل رفاقت کے بعد ان سے الگ ہو گیا۔"(۱۳)

"زینہ" خالد فتح محمد کا ایک منفرد ناول ہے۔ جو ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا۔ اس ناول میں معاشرے میں سماجی شعور کی بہت خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس ناول میں ملکی حالات، صحافت اور دہشتگردی کے بارے بڑی تفصیل سے آگاہی دی گئی ہے۔ دہشت گردی سے ملک میں پیدا ہونے والے خوف وہراس کو بیان کیا گیا ہے اور اس کو روکنے کے لیے تجاویز بھی دی ہیں۔ کیسے ہماری سیاسی جماعتیں اس ملک کے نظام کو چلاتی ہیں ایسے مظاہر کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس ناول کا ہر کردار بلا کا ذہین اور طاقتور دکھایا گیا ہے۔ ناول میں رومانیت کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔ ہر کردار سماجی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کوشاں ہے اور اپنی منزل پانے کے لیے انتھک محنت کرتا ہے۔

خالد فتح محمد نے اپنے ناولوں میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمارے معاشرے کے مسائل کا پورا فہم ہے۔ وہ ایک نبض شناس کی طرح سماج میں موجود برائیوں کی عمدہ طریقے سے نشاندہی کرتے ہیں۔ کہیں سیاستدانوں کے ہاتھوں عوام کے حقوق سلب کیے جانے کو بیان کرتے ہیں تو کہیں اداروں کی بے جا مداخلت کو موضوع بناتے ہیں۔ کہیں کسانوں پر ہونے والے ظلم کو اجاگر کرتے ہیں تو کہیں سیاسی کارکنوں کے استحصال کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے پسماندہ طبقے کے مسائل کی عمدہ عکاسی کی ہے:

> "ناول نگار نے غریبوں، کسانوں اور مزارعوں کی زندگی کے دکھوں کی عمدہ منظر کشی کی ہے۔ جاگیر دار اور زمین دار اپنے شوق پورے کرنے کے لیے گھوڑے پالتے ہیں۔ کتوں کی پرورش کرتے ہیں۔ کبوتر، تیتر اور بٹیر پال کر مقابلے کرواتے ہیں۔ گھوڑوں اور کتوں کی پرورش کے لیے انہیں مربے کھلائے جاتے ہیں۔ دودھ پلایا جاتا ہے مگر بد قسمتی سے ان جانوروں کی خدمت کرنے والے انسانوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔"(۱۴)

خالد فتح محمد نے اپنی زندگی میں جس برائی کو معاشرے میں پایا اس پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول پڑھنے کے بعد قاری تجسس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خالد فتح محمد کے ناولوں کے کردار ہمارے معاشرے میں چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر کے بارے محمود احمد قاضی کہتے ہیں:

> "خالد فتح محمد کے ہر لفظ میں ایک راجپوتی شان جھلکتی ہے۔ وہ ایک ایسا دیوانہ ہے جو ہر وقت ہوش میں رہتا ہے۔ اس میں نثر کے قاری کو اچھی اور معیاری چیزیں پڑھنے کو دی جائیں جب کوئی شخص "پہلی بارش" 'ابا کا باغیچہ' جیسے افسانے لکھ لے تو پھر اسے اور کیا چاہیے جب کہ اس کے پاس خلیج جیسا ناول بھی ہو۔ خالد نے افسانے، ناول اور ترجمے میں یکساں مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اردو نثر ان کے کمالات کے بغیر شاید ایسی امیر نا ہوتی جتنی کہ اب ہے۔ خالد فتح محمد اردو ادب کا ایک Front Line کا لڑاکا ہے۔ ان کے کندھوں پر کامیابی کے بلوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ جس طرح محبت اپنا اظہار خود ہوتی ہے اسے ڈربے کی ضرورت نہیں ہوتی اسی طرح خالد فتح کا فکشن خود اس کی پہچان بن چکا ہے۔"(۱۵)

خالد فتح محمد ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں میں پاکستانی معاشرے کی شاندار عکاسی کرتے ہوئے ہمارے سماجی رویوں کو عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ ان کے ناول پری، سانپ سے زیادہ سیر اب، خلیج، اے عشق بلا خیز، شہر مدفون، سودو زیاں کے درمیان، کوہ گراں اور زینہ میں سے ہر ایک ناول میں کسی نہ کسی اہم سماجی مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ ناول زینہ اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں مذہبی منافرت کے مظاہر، صحافت میں درپیش مسائل اور دہشت گردی جیسے اہم موضوعات کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ناول کے کردار جاندار اور پلاٹ دلکش ہے۔ اس لحاظ سے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خالد فتح محمد کا ناول زینہ پاکستانی سماج کا عمدہ عکاس ہے اور ناول نگار نے سماجی شعور اجاگر کرنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خالد فتح محمد، زینہ، عکس پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۱۹ء، ص:۱۱

۲۔ ایضاً، ص:۳۷

۳۔ ایضاً، ص:۳۷

۴۔ ایضاً، ص:۳۸

۵۔ ایضاً، ص:۴۶

۶۔ ایضاً، ص:۷۱

۷۔ ایضاً، ص:۳۷

۸۔ ایضاً، ص:۹۰

۹۔ ایضاً، ص:۱۰۳

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۴۷

۱۲۔ ایضاً، ص:۲۰۲

۱۳۔ ایضاً، ص:۲۰۲

۱۴۔ مشتاق عادل، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ناول اور طبقاتی کشمکش، فروغ زبان پبلشرز ساہیوال، ۲۰۲۱، ص:۱۷۲

۱۵۔ عائشہ غوری، خالد فتح محمد کی ناول نگاری ،(مقالہ ایم فل)، مملوکہ: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی ،فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص:۹

References in Roman

1. Khalid Fateh Muhammad, Zina, Aks Publications, Lahore, 2019, P.11
2. Khalid Fateh Muhammad, Zina, P.37
3. Ibid, P.37
4. Ibid, P.38
5. Ibid, P.46
6. Ibid, P.71
7. Ibid, P.73
8. Ibid, P.90
9. Ibid, P.103
10. Ibid, P.111
11. Ibid, P.147
12. Ibid, P.202
13. Ibid, P.202
14. Mushtaq Adil, Dr, Pakistani Urdu Novel and Tabqati Kashmkash, Faroog e Zaban Publishers, Sahiwal, 2021, P.172
15. Ayesha Ghouri, Khalid Fateh Muhammad ki fateh Nigari, (Mphil Thesis), GC University, Faisalabad, 2016,P.9

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	ملخص	کلیدی الفاظ
ڈاکٹر آیقوت کشمیر	ترکی اور پاکستان کی دوستی کو مربوط کرنے والے مشترکہ یادگاری مقامات کا تحقیقی جائزہ	۱-۱۰	اس تحقیقی مقالہ میں پاکستان اور ترکی کے درمیان ثقافتی تعامل میں فعال کردار ادا کرنے والے یادگاری مقامات کا فرانسیسی مورخ پیئر نورا (Pierre Nora) کے نظریہ یادداشت (lieu de mèmoire) کی روشنی میں تجزیہ کیا گیاہے۔ اس کے علاوہ، اس تحقیق میں اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ کسی معاشرے کی شناخت کی عکاسی کرنے والے یادگاری مقامات کو کس وجہ سے اور کس طریقے سے ایک تاریخی حقیقت کی علامت کے طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔	ترکی، پاکستان، فنون لطیفہ، یادداشت، یادگاری مقامات، ثقافتی تعامل
ڈاکٹر محمد ارشد (کامران)	ہجرت کا تاریخی وادبی منظر نامہ اور دیویندر اسّر کا ناسٹلجیا	۱۱-۲۴	ہجرت کا تاریخی وادبی منظر نامہ اور دیویندر اسّر کا ناسٹلجیا اس تحقیق میں اجاگر کیا گیا ہے۔ دیویندر اسّر ماضی کی یادوں کے کرب میں مبتلا ہوکر اپنے کرداروں کی معرفت ناسٹلجیائی عنصر کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اس کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اس تحقیق کا مقصد ہے۔	سفاکانہ قتل، ہجرت، آرزو ،اداسی،افسردگی، فرقتِ وطن کا کرب ،ناسٹلجیا
وقاص رفیع / ڈاکٹر کامران عباس کاظمی	چوہدری افضل حق کی آپ بیتی "میرا افسانہ "کا نو آبادیاتی تجزیہ	۲۵-۳۸	اس مقالے میں چوہدری افضل حق کی آپ بیتی "میرا افسانہ میں نو آبادیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ چوہدری افضل حق (۱۸۹۱-۱۹۴۲) اردو کے نامور ادیب تھے ۔ انہوں نے اپنی تحریریوں میں انگریزی استعمار کی خامیوں کو	نو آبادیاتی، استحصال، آپ بیتی، شکست وریخت، سامراج، اخلاقی انحطاط

				کھل کر بیان کیا ہے۔ان کی اس آپ بیتی میں لوگوں کے مختلف رویوں ،نفسیاتی کیفیات ،انسانی شخصیت میں ہونے والی شکست وریخت ،ناآسودہ خواہشات اور مغرب کی بے جا تقلید کی تصویر کھینچی ہے۔	
فرزانہ رانی/ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	"صحیفہ "کا سرسید احمد خاں نمبر ۔۔۔۔ تجزیاتی مطالعہ	۳۹-۵۰	"صحیفہ " پاکستان کا معروف جریدہ ہے۔اس مقالے میں صحیفہ کے سرسید نمبر کا خصوصی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مجلس ترقی ادب نے سرسید احمد خاں کی دوصد سالہ سال پیدائش کی مناسبت سے "صحیفہ " کی خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جو جولائی ۲۰۱۷ سے ستمبر ۲۰۱۸ کے شمارے کی صورت میں منظر عام پر آئی۔ اس خاص شمارے کے سارے مضامین ومقالات اپنی جگہ اہم ہیں لیکن اس مختصر مقالے میں چند مضامین ومقالات کا قدرے تفصیلی جائزہ اور کچھ کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے سرسید نمبر کی اہمیت واضح ہو گی۔	صحیفہ،خاص شمارے،انقلابی، سماجی ادارے، تصنیف وتالیف، مقالات،جریدہ، بغاوت ہند
ڈاکٹر محمد نعیم	اردوناول میں شنوی فکر کا کلامیاتی تجزیہ	۵۱-۶۸	اس تحقیق میں اردو ناول میں شنوی فکر کا کلامیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔کلامیہ سماجی استقلال اور تبدیلی ہر دو کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔یہیں سے ناول میں موجود شنوی فکر کے کلامیاتی تجزیے کا جواز ملتا ہے۔ کسی کلامیے کی خصوصیات متعین کرنے میں سماجی حالات کا کردار ہوتا ہے۔یعنی سماجی حالات کی تبدیلی، کلامیے کے خصائص کو بدل دیتی ہے۔ اس	کلامیہ،شنوی فکر، سوشیور، تبدیلی، ماڈلوں،عملیدگی، متکلمین، رسومیات، تفاعل،ثقافتی بیانیوں

				مقالے میں کلامیاتی تجزیے کو استعمال کرتے ہوئے اردو ناول میں موجود شنوی فکر کے دو بنیادی ماڈلوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
ڈاکٹر ساجد جاوید	تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی: تکنیک، معیار، مسائل اور حدود	۶۹-۸۰	اردو ادب کی مستند اور معیاری تاریخ کی بات کی جائے تو چند ایک تواریخ کو اس ضمن میں بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے جن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی چار جلدوں پر مشتمل کتاب "تاریخ ادب اردو " سر فہرست آتی ہے۔اس میں تکنیک کی سطح پر متنوع تبدیلیاں پیش نظر رکھ کر ادبی تاریخ نویسی کا منصوبہ بروئے کار لایا گیا۔چار جلدوں میں منقسم "تاریخ ادب اردو" اپنے مشمولات کے حساب سے حوالے کی چیز ہے مگر اس کے فنی محاسن کو دیکھا جائے تو ادراک ہوتا ہے کہ چاروں جلدوں میں تکنیک کے مختلف ماڈلز پیش کیے گئے ہیں۔	جمیل جالبی، تبسم کاشمیری، دلی، دکن، لکھنو، تاریخ ادب اردو، مولانا محمد حسین آزاد، گیان چند جین
ڈاکٹر شگفتہ فردوس / ڈاکٹر محمد افضال بٹ	حفیظ تائب کی نعت کے تخلیقی زاویے	۸۱-۹۴	اس تحقیقی مقالے میں حفیظ تائب کی نعت کے تخلیقی زاویے اجاگر کیے گئے ہیں۔ نعت کے موضوع سے حفیظ تائب کی تخلیقی وابستگی کے اثرات ان کے طرز اظہار میں نمایاں ہیں ، سبک الفاظ کا انتخاب ، مترنم بحور، جذبے کا رچاو، جو اس دور کے نعت گو شاعروں کے نمایاں اوصاف ہیں، جذب و کیف اور اخلاص و گداز کے جوہر نے انہیں معاصر نعت نگاروں	نعت، شاعروں، معاصر، اطاعت، مثنوی، رباعی، قطعہ، مخمس ومسدس، جمالیاتی قدروں، عقیدت

				کی صف میں ممتاز و منفرد حیثیت عطا کرتے ہیں۔
عبید اللہ / پروفیسر ڈاکٹر محمد ارشد اویسی	اقبال اور رومی کا تعلق ڈاکٹر ملک حسن اختر کی نظر میں	۹۵-۱۰۴	ڈاکٹر ملک حسن اختر نے "اقبال اور رومی" کے نام سے اپنی کتاب "اقبال اور مسلم مفکرین" میں ایک مضمون شامل کیا ہے۔ اس میں ملک حسن اختر نے اقبال اور رومی کے تعلق کا اچھوتے انداز میں جائزہ لیا ہے اور اس موضوع کے کچھ نئے زاویے سامنے لائے ہیں۔	اقبال، رومی، تصوف، عامۃ الناس، سنائی، باطنی، خودی، تخریبِ ذات
راج محمد / ڈاکٹر تحسین بی بی	پشاور ٹیلی وژن کے ڈرامے کے ارتقا میں یونس قیاسی کا کردار	۱۰۵-۱۱۴	یونس قیاسی اپنی منفرد پہچان کی بدولت خیبر پختونخوا میں ڈرامے کے سرخیل ہیں۔ ان کو بیک وقت اردو، پشتو اور ہندکو کا کامیاب ڈراما نگار کہا جاتا ہے۔ صوبہ خیبر پختونخوا میں ٹیلی وژن کے طبع زاد اردو ڈراما کی ترقی وارتقا میں یونس قیاسیؔ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے میں پشاور ٹیلی وژن ڈراما کے ارتقا میں یونس قیاسیؔ کا کردار اجاگر کیا گیا ہے۔	ہندوستانی، خیبر پختونخوا، خود مختار، قوتِ مشاہدہ، یونس قیاسی، جاگیر دارانہ نظام، ٹیلی وژن، آفاقیت
سعدیہ امتیاز / ڈاکٹر مشتاق عادل	خالد فتح محمد کے ناول زینہ میں سماجی شعور	۱۱۵-۱۲۴	خالد فتح محمد منفرد لہجے کے ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں میں سماجی شعور کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ اس تحقیق میں خالد فتح محمد کے ناول زینہ میں سماجی شعور کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔	سماجی شعور، زینہ، معاشرے، غیر ملکی طاقتیں

CONTENTS

Editorial		
A Research Review of Common Memorial Sites, Connecting the Friendship between Turkey and Pakistan	Dr. Aykut Kismir	1
Historical and Literary Background of Migration and Devender Isar's Nostalgia	Dr. Muhammad Arshad (Kamran)	11
A Colonial Analysis of "Mera Afsana" An Autobiography of Choudhary Afzal Haq	Waqas Rafi/ Dr. Kamran Abbas Kazmi	25
An Analytical Study of Sir Syed Ahmad Khan Number of "Saheefa"	Farzana Rani/ Rafaqat Ali Shahid	39
Discourse Analysis of Binary Thinking in Urdu Novel	Dr. Muhammad Naeem	51
Jameel Jalibi's History of Urdu Literature; The Techniques, Standard and Limitations, A Critical and Research Analyses	Dr. Sajid Javed	69
Creative Aspects of Hafeez Taib's Naat	Dr. Shagufta Firdous / Dr. Muhammad Afzal Butt	81
Relationship of Iqbal and Rumi in the eyes of Dr.Malik Hassan Akhtar	Ubaid Ullah/ Professor Dr. Mohammad Arshad Ovaisi	95
Role of Younas Qayasi in Evolution of Drama on Peshawr Television	Raj Muhammad / Dr.Tahseen Bibi	105
Social Counciousness in Khalid Fateh Muhammad's Novel "Zina"	Sadia Imtiaz/ Dr. Mushtaq Adil	115
Index	Sidra Tahir	125

“Daryaft”

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

Research Journal of Urdu Language & Literature

Published by: National University of Modern Languages, Islamabad

Department of Urdu Language & Literature

Subscription / Order Form

Name: _____

Mailing Address: _____

_____

City Code: _____ Country: _____

Tel: _____ Fax: _____

Email: _____

Please send me _____ copy/ copies of The “Daryaft”

I enclose a receipt of Online Fund Transfer of Pkr/US$ _____ In Daryaft Account No: 0550380006660, Askari Bank I-9 Branch, Islamabad.

Signature: _____ Dated: _____

Note:
Price per Issue in Pakistan: Pkr 600 (including Postal Charges)
Price Per Issue other countries: US$ 5 (excluding Postal Charges)
Please return to: Department of Urdu, NUML, H-9/4, Islamabad, Pakistan
Phone: 051-9265100-10, Ext: 2262

DARYAFT

Vol: 14, Issue: 02

July -December 2022

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

"DARYAFT" is a HEC Recognized Journal

It is included in Following National & International Databases:

1. DOAJ (Directory of Open Access Journals)
2. Crossref
3. MLA database (Directory of Periodicals & MLA Bibliography)
4. Index Urdu Journal (IIUI),
5. International Scientific Indexing (ISI)
6. Scientific Indexing Services (SIS)
7. Tehqeeqat, A Research Indexing System
8. EuroPub (Directory of Academic and Scientific Journals)

Editors:

Editor: Dr. Naeem Mazhar

Sub-Editor: Dr. Mujahid Abbas

Department of Urdu, NUML, Islamabad

Composing & Layout: Muhammad Abrar Siddiqui

ADVISORY BOARD

International

Prof. Dr. Heinz Werner Wessler

Department of Linguistics and Philology, UPPSALA, Sweden

Prof. Dr. Halil Toker

Head of Urdu Language and Literature Chair, Istanbul University, Istanbul

Prof. Dr. Khawaja Ikram ud Din

Department of Urdu, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

Prof. Dr. Shahabuddin

Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh, India

Prof. Dr. Moinuddin A. Jinabade

Centre for Indian Languages, School for Languages Literature and Cultural Studies Jawaharlal Nehru University, India

Prof. Dr. Asuman Belen Ozcan

Head, Department of Urdu, University of Ankara, Ankara, Turkey

Prof. Dr. Ibrahim Muhammad Ibrahim

Head, Department of Urdu, Faculty of Humanities, University of Al-Azhar, Cairo, Egypt

Prof. Dr. Muhammad Mahfooz Ahmad

Department of Urdu, Jamia Millia Islamic, New Delhi, India

Prof. Dr. Mehmoodul Islam

Department of Urdu, Faculty of Arts, Dhaka University, Dhaka, Bangladesh

Dr. Arzu Suren

Department of Urdu, University of Istanbul, Istanbul, Turkey

National

Prof. Dr. Abdul Aziz Sahir

Head, Department of Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad

Prof. Dr. Muhammad Kamran

Department of Urdu, University of Punjab, Lahore

Prof. Dr. Tanzeem-ul-Firdous

Head Department of Urdu, University of Karachi, Karachi

Prof. Dr. Rubina Tareen

Department of Urdu, B.Z University, Multan

Prof. Dr. Khalid Mehmood Khattak

Head Department of Urdu, University of Balochistan, Balochistan

Prof. Dr. Zia Ul Hassan

Department of Urdu, Oriental College, University of Punjab, Lahore

Prof. Dr. Saima Irum

Head Department of Urdu, Govt College University, Lahore

Prof. Dr. Sohail Abbas

Head Department of Urdu, Ghazi University, DG Khan

Technical Assistantce: Muhammad Abrar Siddiqui

FOR CONTACT
Department of Urdu Language & Literature,
National University of Modern Languages, H-9, Islamabad
Telephone: 051-9265100-10, Ext: 2262
E-mail: daryaft@numl.edu.pk
Website (OJS): *https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft*

DARYAFT

Vol: 14, Issue: 02

July -December 2022

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

PATRON IN CHIEF

Maj. Gen. ® Muhammad Jaffar HI (M) [Rector]

PATRON

Brig Syed Nadir Ali [Director General]

Chief Editor

Prof. Dr. Jamil Asghar Jami [Dean Faculy of Languages]

EDITOR

Dr. Naeem Mazhar

SUB-EDITOR

Dr. Mujahid Abbas

NATIONAL UNIVERSITY OF MODERN LANGUAGES

ISLAMABAD